سیّد مبارک شاہ کی شاعری کا موضوعاتی مطالعہ

(بحوالہ خصوصی: تصوف، کونیات، سماجی شعور)

تحقیقی مقالہ برائے ایم ایس اردو

مقالہ نگار:

شاہد بلال حسرت

رجسٹریشن:202-FLL/MSURDU/F-16

نگران:

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اردو (میل)

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

معاون نگران:

ڈاکٹر ارشد آصف (ارشد معراج)

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو (میل)

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

Accession No TH24671

MS
891.439/008
ح س س

سید مبارک شاہ - شاعری - موضوعاتی مطالعہ

اردو ادب - 〃 - 〃 〃

سیّد مبارک شاہ کی شاعری کا موضوعاتی مطالعہ

(بحوالہ خصوصی: تصوف، کونیات، سماجی شعور)

(تحقیقی مقالہ)

مقالہ نگار

شاہد بلال حسرت

رجسٹریشن نمبر:202-FLL/MSURDU/F16

مقالہ برائے ایم ایس (اُردو)

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

یہ مقالہ

ایم ایس (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

کلیۂ زبان و ادب

شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

درج ذیل مقالہ شعبۂ اُردو، کلیہ زبان وادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں ایم ایس اُردو کی ڈگری کی جزوی منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ دستخطی نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے اور MS اُردو کی ڈگری تفویض کرنے کی منظوری دیتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **سید مبارک شاہ کی شاعری کا موضوعاتی مطالعہ (بحوالہ خصوصی: تصوف، کونیات، سماجی شعور)**

مقالہ نگار: شاہد بلال حسرت

رجسٹریشن نمبر: 202-FLL/MSURDU/F16

کمیٹی دفاع مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف
ڈین
کلیہ زبان وادب

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
چیئرمین
شعبۂ اُردو

ڈاکٹر صفدر رشید
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
بیرونی ممتحن

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
اندرونی ممتحن

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن
ایسوسی ایٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
نگران مقالہ

ڈاکٹر ارشد محمود آصف (ارشد معراج)
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
معاون نگران

ستمبر، 2021ء

اقرار نامہ

شاہد بلال حسرت، رجسٹریشن نمبر:202-FLL/MSURDU/F16 حلفیہ اقرار کرتا ہوں کہ مقالہ بعنوان

''سیّد مبارک شاہ کی شاعری کا موضوعاتی مطالعہ (بحوالہ خصوصی: تصوف، کونیات، سماجی شعور)''

میں پیش کیا گیا کام میری ذاتی کاوش ہے اور سرقے سے پاک ہے۔ میں نے یہ کام بین الاقوامی اِسلامی، یونیورسٹی، اسلام آباد کے ایم ایس (اُردو) کے سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر عزیز ابن الحسن کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ پیش کروں گا۔

شاہد بلال حسرت

مقالہ نگار

تصدیق نامہ

شاہد بلال حسرت نے رجسٹریشن نمبر:202-FLL/MSURDU/F16 کے تحت اپنا تحقیقی و تنقیدی مقالہ برائے ایم ایس اردو **"سیّد مبارک شاہ کی شاعری کا موضوعاتی مطالعہ (بحوالہ خصوصی: تصوف، کونیات، سماجی شعور)"** میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ یہ مقالہ تحقیقی و تنقیدی حوالے سے ایم ایس کے معیار کے مطابق ہے۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ یہ مقالہ جانچ کے لیے ممتحنین کو بھجوا دیا جائے۔

ڈاکٹر عزیز ابن الحسن

صدر شعبہ اُردو (میل)

کلیۂ زبان و ادب

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

فہرست ابواب

	عنوان
	پیش لفظ
باب اول	سیّد مبارک شاہ: فن و شخصیت
باب دوم	سیّد مبارک شاہ کی شاعری میں تصوف
باب سوم	سیّد مبارک شاہ کی شاعری میں کونیات
باب چہارم	سیّد مبارک شاہ کی شاعری میں سماجی شعور
	ماحصل
	کتابیات

پیش لفظ

میری تحقیق کا عنوان **"سیّد مبارک شاہ کی شاعری کا موضوعاتی مطالعہ (بحوالہ خصوصی: تصوف، کونیات، سماجی شعور)"** ہے۔ سیّد مبارک شاہ اردو شاعری کا اہم نام ہے۔ ان کی شاعری میں تصوف اور اس کے ذیلی موضوعات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ وہ مذہبی ہم آہنگی کا پیغام اپنی شاعری میں دیتے ہیں۔ عرفان ذات سے عرفان کائنات تک کا سفر کرتی اس شاعری میں سائنس دوسرا اہم حوالہ ہے۔ وہ ستاروں، سیاروں اور کہکشاؤں کے بننے، ٹوٹنے اور فنا ہونے کی داستان مکمل سائنسی شعور کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں معاشرتی مسائل کا بیان بھی ملتا ہے۔ سیّد مبارک شاہ کی شاعری میں آپ کی ملاقات ایک درد دل رکھنے والے انسان سے ہوتی ہے۔

یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب: "سیّد مبارک شاہ: فن و شخصیت" ہے۔ جس میں سید مبارک شاہ کے مختصر حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ ان کے شعری سفر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب کے آخر میں ان کی کتابوں کا مختصر تعارف اور ان کے معاصرین کی ان کی شاعری کے حوالے سے رائے بیان کی گئی ہے۔

دوسرا باب: سیّد مبارک شاہ کی شاعری میں تصوف " ہے۔ جس میں سید مبارک شاہ کی شاعری میں تصوف کے موضوع کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں وضاحت کی گئی ہے کہ سید مبارک شاہ کی شاعری کا خمیر تصوف ہے۔ ان کے شاعری کا محور تصور خدا ہے اور وہ خدا کی تلاش اور اس کے ساتھ انسانی تعلق کی بازیافت کو اپنی شاعری کا بنیادی موضوع بناتے ہیں۔ ان کے ہاں گمان، یقین، تشکیک، انکار، استفسار، شکوہ، نارسائی اور محبت

کے موضوعات خدا کی ذات سے منسلک ہیں۔سید مبارک شاہ عرفان ذات سے عرفان کائنات تک کا سفر اپنی شاعری میں طے کرتے ہیں۔

تیسرا باب ''سیّد مبارک شاہ کی شاعری میں کونیات'' ہے۔ سید مبارک شاہ اکیسویں صدی کے شاعر ہیں۔وہ جدید دنیا کے علوم سے آگاہ ہیں۔ان کے یہاں سائنسی شعور پایا جاتا ہے۔ان کی شاعری میں یہ سائنسی شعور وجدانی نہیں ہے بلکہ اس کے پس منظر میں ان کی تحقیق اور مطالعہ جھانکتا ہے۔ان کی شاعری میں کونیاتی حوالے بکثرت پائے جاتے ہیں۔

چوتھا باب ''سیّد مبارک شاہ کی شاعری میں سماجی شعور'' کے عنوان سے ہے۔شاعر اپنے سماج سے جڑا ہوتا ہے۔اس کے ارد گرد معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے شاعر نہ صرف اس سے اثر لیتا ہے بلکہ اس کی شاعری میں اس کا عکس بھی نظر آتا ہے۔اس باب میں سید مبارک شاہ کی شاعری میں سماجی شعور کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ آخر میں ماحصل کے عنوان کے اس تحقیق کے حاصلات کو قلم بند کر دیا گیا ہے۔

یہ مقالہ ڈاکٹر عزیز ابن الحسن اور ڈاکٹر ارشد معراج کی راہنمائی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ انہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود مقالے کی تصحیح و ترتیب میں میری راہنمائی کی۔

مقالے کے آغاز سے لے کر تکمیل کے مراحل تک صدرِ شعبہ اُردو، ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، ڈاکٹر ارشد معراج، ڈاکٹر کامران عباس کاظمی اور محمد اسحاق خان نے بے حد معاونت کی جس پر میں ان کا ممنون احسان ہوں۔

دوستوں میں عدنان بشیر اور امجد کارلو کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو مقالے کا خاکہ جمع کرانے سے لے کر مقالہ جمع کرانے تک ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔ عدنان بشیر کا ساتھ مقالے کے لیے کیے جانے والے انٹرویوز میں بھی رہا۔

سید مبارک شاہ کے حوالے سے ان کے گھر بھی جانا ہوا اور ٹیلی فون پر ان کی بیٹی فاطمہ سید سے مسلسل رابطہ رہا۔ سید مبارک شاہ کے حوالے سے مضامین اور ضروری مواد فراہم کرنے پر میں سلطان ناصر، جام حفیظ، فاطمہ سید، سعدیہ عاشق اور محمد کاشف کا بھی شکر گزار ہوں۔

آخر میں والدین کا شکریہ ادا کرنا بھی واجب ہے جن کی بدولت آج میں اس سنگ میل کو عبور کرنے کے قابل ہوا ہوں۔ خاتون خانہ نے اقتباسات تلاش کرنے اور مقالہ کمپوز کرنے میں بہت مدد کی۔

شاہد بلال حسرت

۱۲ اپریل ۲۰۲۱ء

باب اول

سیّد مبارک شاہ: فن و شخصیت

سیّد مبارک شاہ: ابتدائی کوائف

سیّد مبارک شاہ یکم جنوری 1961ء کو تلہ گنگ اور میانوالی کے درمیان پوٹھوہار اور سرائیکی بیلٹ کے وسط میں موجود واقع قصبہ ڈھلی ڈھگیٹال میں پیدا ہوئے۔ چار سال کی عمر میں اسکول میں داخل ہوئے۔ پرائمری اسکول کے بعد چھٹی کلاس سے انھوں نے انگریزی پڑھنی شروع کی۔ مڈل تک ٹاٹوں پر بیٹھ کر پڑھے۔ ان کے اپنے بقول "ٹاٹوں پر بیٹھ کے پڑھا۔ چھٹی جماعت سے اے بی سی شروع کی اور میٹرک تک سیکنڈ ڈویژن حاصل کی۔"1 سیّد مبارک شاہ کی والدہ انھیں ڈاکٹر بنانا چاہتی تھیں جبکہ ان کے والد چاہتے تھے کہ وہ فوجی افسر بنیں۔ مگر انھوں نے خود سے کوئی پلاننگ نہیں کی تھی۔ سیّد مبارک شاہ کی والدہ اگرچہ کچھ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں مگر انھوں بچوں تربیت خوب کی۔ وہ اپنی والدہ کے بارے میں کہتے ہیں۔

> "ماں گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتی تھیں۔ اگر میچ دیکھنے جانا بھی ہوتا تھا تو چار دن پہلے اجازت طلب کرنی ہوتی تھی۔ ایک دن کالج سے دیر ہوگئی تو والدہ صاحبہ مجھے لینے کالج آگئیں۔"2

سیّد مبارک شاہ نے 1976ء میں سی بی اسکول راولپنڈی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ وہ ریاضی میں خاصے کمزور تھے میٹرک میں ریاضی کے پیپر میں وہ بہت مشکل سے پاس ہوئے۔ انھوں نے 1978ء میں گورڈن کالج راولپنڈی سے ایف اے اور 1980ء میں اسی کالج سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ 1983ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے سیاسیات میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور اس کے لیے انھوں نے مقالہ بعنوان "ڈویلپمنٹ آف لوکل سیلف گورنمنٹ ان دی پنجاب 1901-1918" لکھا۔ سیّد مبارک شاہ نے 1984ء میں واپڈا کے محکمے میں ملازمت اختیار کی اور گریڈ سترہ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ اس کے بعد انھوں نے سی ایس ایس بننے کی ٹھان لی اور 1985ء میں انھوں نے سی ایس ایس کا امتحان پاس کیا اور بیوروکریسی کا حصہ بن گئے۔ سی ایس ایس میں انھوں نے پنجابی بطور اختیاری مضمون چنا اس پرچے میں انھوں نے سو میں سے اکیانوے نمبر ز لے کر پنجاب بھر میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ 1987ء تک وہ سول سروس اکیڈمی میں زیر تربیت رہے۔ وہ جن مختلف عہدوں پر تعینات رہے ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

ڈپٹی کنٹرولر اکاؤنٹس، پی۔او۔ایف واہ کینٹ 1990ء تا 1995ء

ڈپٹی ڈائریکٹر، ڈیفنس پرچیز ملٹری اکاؤنٹس، راولپنڈی 1996ء

ڈپٹی کنٹرولر آڈٹ ڈیفنس، راولپنڈی 1997ء

ڈپٹی ڈائریکٹر، واپڈا آڈٹ تربیلہ 1998ء تا 2001ء

ڈپٹی فنانشل ایڈوائزر، پاکستان ریلوے اسلام آباد 2001ء تا 2003ء

ڈائریکٹر فنانس، بارانی یونیورسٹی راولپنڈی 2004ء تا 2007ء

ڈائریکٹر ٹریننگ ملٹری اکاؤنٹس راولپنڈی 2008ء تا 2010ء

جوائنٹ سیکرٹری وزارت دفاع، حکومت پاکستان 2011ء

کنٹرولر ملٹری اکاؤنٹس پی۔او۔ایف واہ کینٹ 2012ء تا 2015ء

خاندانی پس منظر

سیّد مبارک شاہ کے آباء کا تعلق کشمیر سے تھا۔ان کے آباؤاجداد ایران سے ہجرت کر کے کشمیر آبسے تھے۔ان کا تعلق سیّد گھرانے سے تھا۔ آپ ہمدانی سادات کے سربراہ سیّد علی ہمدان کی اولاد میں سے تھے۔ان کے والد کا نام ولایت شاہ اور والدہ کا نام زیب النساء تھا۔ آپ کے پردادا کا نام بھی سیّد مبارک شاہ تھا۔ جبکہ دادا کا نام سیّد محمد شاہ تھا۔ ولایت شاہ کی پیدائش کشمیر میں ہوئی۔ولایت شاہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ انھیں بچپن ہی سے عربی اور فارسی سے گہری دلچسپی تھی۔ سیّد ولایت شاہ اپنے والد کی وفات کے بعد کشمیر سے ہجرت کرکے میانوالی کے قریب ایک گاؤں "ڈھلی ڈھگڑال" میں آگئے۔جہاں پر سیّد مبارک شاہ کی پیدائش ہوئی۔سیّد مبارک علی شاہ کے نانا غلام جیلانی شاہ پیر مہر علی شاہ کے خاص دوست تھے اور ان سے بہت عقیدت بھی رکھتے تھے۔

سیّد مبارک علی شاہ کا نام ان کے والد ولایت علی شاہ نے رکھا تھا۔ پردادا "سیّد مبارک شاہ" اور دادا "سیّد محمد شاہ" کے ناموں کو ملا کر رکھا گیا۔ آپ کا قلمی نام سیّد مبارک شاہ تھا۔

افراد خانہ

سیّد مبارک شاہ کے والد سیّد ولایت فوج میں ملازم تھے۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے 9 بچوں سے نوازا تھا۔ جن میں چار بیٹے اور پانچ بیٹیاں شامل ہیں۔ سیّد مبارک شاہ اپنے بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھے۔۔ سیّد ولایت کے بڑے فرزند سیّد غلام مصطفیٰ شاہ سعودی عرب میں PIA کے گروپ 6 میں ملازم ہیں۔ بڑی بیٹی سیّدہ نجم النساء نے ایم اے اردو کیا۔ وہ ایف۔ جی ہائی گورنمنٹ سکول راولپنڈی میں گریڈ 16 میں سیکنڈری اسکول ٹیچر (SST) ہیں۔ سیّد ولایت شاہ کی چوتھی بیٹی غلام سکینہ نے بھی ایم اے اردو کیا۔ وہ بھی راول پنڈی میں تدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ تیسرے بیٹے سیّد غلام جیلانی شاہ بہن بھائیوں میں پانچویں نمبر پر ہیں۔ اُن کا نام اپنے نانا کے نام پر رکھا گیا۔ غلام جیلانی شاہ نے ایم اے سیاسیات پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پاس کیا۔ وہ پچھلی دو دہائیوں سے پولٹری کے کاروبار سے وابستہ ہیں۔ سیّد ولایت شاہ کی ایک اور بیٹی سیّدہ عابدہ طاہرہ ہیں۔ انھوں نے B.A کیا اور وہ خاتون خانہ کے فرائض سنبھالتی ہیں۔ سیّدہ صدف زہرا کا نمبر بہن بھائیوں میں ساتواں ہے۔ وہ MBBS کرنے کے بعد پاکستان آرمی میں میجر ڈاکٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔ سیّد ولایت شاہ کے ایک اور صاحب زادے سیّد کامران علی شاہ آرمی آفیسر ہیں۔ سیّد ولایت شاہ کی آخری اولاد اور سیّد مبارک شاہ کی سب سے چھوٹی بہن سیّدہ تبسم بتول ایم اے انگریزی ہیں اور اسلام آباد کے ایک پرائیویٹ ادارے میں تدریس کے فرائض انجام دیتی ہیں۔

شادی / اولاد

مبارک شاہ کی شادی قریبی رشتے داروں کے یہاں 1985 میں ہوئی۔ ان کی اہلیہ سیّدہ نصرت شاہ بی اے پاس ہیں۔ سیّد مبارک شاہ ان کا ذکر ہمیشہ ایک بہت اچھی بیوی کے طور پر کرتے تھے وہ بچوں کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دیتی ہیں۔ وہ ابتداء سے سیّد مبارک شاہ کی شاعری دلچسپی سے پڑھتی ہیں۔ انھیں مبارک شاہ کا یہ شعر بہت پسند ہے:

آدم کی کسی روپ میں تحقیر نہ کرنا
پھرتا ہے زمانے میں خدا بھیس بدل کر

(کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 47)

سیّد مبارک شاہ کے سسر بھی ان کے والد کی طرح فارسی، قرآن پاک اور اقبالیات میں خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔ سیّد مبارک شاہ کی اولاد میں دو بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہیں۔ بڑے بیٹے کا نام سیّد علی حسن ہے۔ علی حسن نے میٹرک ڈویژنل پبلک سکول راولپنڈی سے پاس کیا۔ ایف ایس سی انڈس کالج راولپنڈی سے اور بی کام پنجاب ڈگری کالج راولپنڈی سے پاس کیا۔ انھوں نے ایم بی اے اقراء یونیورسٹی سے کیا۔ ان دنوں وہ امریکہ میں مقیم ہیں اور ٹیسٹ ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت کر رہے ہیں۔ سیّد مبارک شاہ کی شاعری میں متعدد مقامات پر علی حسین کا ذکر ملتا ہے مبارک شاہ نے اپنی ایک نظم "تشکر" میں علی حسن کا ذکر نہایت محبت سے کیا ہے۔

"ہیلو میں ٹھیک ہوں لیکن

علی کا کچھ بخار اترا!"

"علی تو ٹھیک ہے بالکل یہ میرے سامنے بیٹھا کھلونوں سے"

کرم ہے میرے مالک کا

خدا کی مہربانی ہے" (مدارِ نارسائی میں، ص 149)

مبارک شاہ کی بیٹی فاطمہ سیّدہ نے نسٹ یونیورسٹی راول پنڈی سے ایم بی اے کیا۔ وہ موبی لنک میں ملازمت کر رہی ہیں۔ مبارک شاہ کہتے تھے کہ انھیں اپنی بیٹی سب بچوں سے زیادہ عزیز ہے۔ فاطمہ سیّدہ لکھنے پڑھنے کے کاموں میں اپنے والد کا ہاتھ بھی بٹاتی تھیں۔ انھیں اپنے والد کی شاعری سے گہرا لگاؤ رہا ہے اور ان کا یہ شعر بہت پسند ہے۔

یہ ہر دن تھوڑا تھوڑا کر کے مرنے کا تکلف کیا
یہ کام اک روز بہتر ہے کہ سارا کر لیا جائے
(مدارِ نارسائی میں، ص 50)

ان کی کلیات کو ترتیب دینے میں فاطمہ سیّدہ کا کافی ہاتھ رہا۔ ان ہی کی فرمائش پر سلطان ناصر اور گل شیر بٹ نے "کلیات سیّد مبارک شاہ" مرتب کیا۔ اور اس کلیات کو جہلم بک کارنر والوں نے شائع کیا۔ آدم حمدانی مبارک شاہ کی سب سے چھوٹے بیٹے ہیں۔ جو موبی لنک میں ملازمت کر رہے ہیں۔

آغاز سخن

سیّد مبارک شاہ کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا وہ جب دوسری کے طالب علم تھے تو ایک روز اُستاد صاحب نے تختی پر املاء لکھوائی۔ انھوں نے املاء کی جگہ ایک شعر لکھ دیا جس پر اُستاد نے انھیں سزا دی لیکن دوسرے دن یہ پتا چلنے پر کہ وہ ولایت شاہ صاحب کے فرزند ہیں گھر آ کر معذرت کر لی۔ وہ شعر یہ تھا:

محمد ﷺ ہیں میرے نبی
میں غم نہ کروں گا کبھی

بچپن کا یہ شوق آہستہ آہستہ پروان چڑھتا رہا۔ مبارک شاہ کہتے ہیں کہ شاعری کا شوق انھیں اپنے والد کو دیکھ کر ہوا کیونکہ ان کے والد کو فارسی، قرآن پاک اور اقبالیات سے خاص دلچسپی تھی۔ انھوں نے باقاعدہ شاعری کا آغاز میٹرک میں نظم "محبت" سے کیا۔ جسکے دو شعر یوں ہیں۔

محبت وہ توکل ہے تدبر جس پر شرمندہ
محبت آگ میں جنت محبت دار پرزندہ
محبت میرا فن بھی ہے محبت میرا پیشہ ہے
میں کوہ غم پہ تنہا ہوں محبت میرا تیشہ ہے

مبارک شاہ جب 1976ء میں فرسٹ ایئر کے طالب علم تھے تو روزنامہ "نوائے وقت" میں ان کی غزل پہلی بار چھپی جس کا ایک شعر کچھ یوں ہے۔

محفل اہلِ جہاں میں کیا کوئی جانے مجھے
دل کسی کے پاس ہو تو آکے پہچانے مجھے

کالج تک آتے آتے سیّد مبارک شاہ کا ادبی ذوق خوب پروان چڑھ چکا تھا۔ کالج میں ڈاکٹر توصیف تبسم مبارک شاہ کے اُردو کے جبکہ ڈاکٹر مقصود جعفری انگریزی کے اُستاد تھے۔ انھوں نے بھی شاعری میں سیّد مبارک شاہ کی حوصلہ افزائی کی مگر اس کے برعکس ان کے ادبی ذوق پر گھر میں ان کی حوصلہ شکنی ہوتی تھی۔ اسی لیے وہ شاعری میں کوئی تخلص بھی اختیار نہ کر سکے۔ مبارک شاہ

جب یونیورسٹی پہنچے تو انھیں انقلابی قسم کی نظمیں پڑھنے پر بڑی پزیرائی ملی۔ یونیورسٹی اور سول سروس اکیڈمی کے زمانہ میں مبارک شاہ کی شاعری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ جس میں مبارک شاہ کی شاعری کو حوصلہ مندی اور ایک فکری جہت عطا ہوئی۔

انھوں نے شاعری میں ابتداء سے انتقال تک کبھی کسی سے باقاعدہ اور مسلسل اصلاح نہیں لی۔ یوں شاعری میں اُن کا باقاعدہ اُستاد کوئی نہیں ہے۔ مختلف اوقات میں وہ چند پڑھے لکھے دوستوں سے کچھ نہ کچھ سیکھتے رہے۔

واہ کینٹ میں رؤف امیر جو ان کے ہم عصر بھی تھے اور شاعر بھی انھوں نے کچھ تکنیکی چیزیں سیکھیں۔ 1990ء سے 1996ء تک وہ اپنا کلام اصلاح کے لیے احمد ندیم قاسمی کو بھیجتے رہے۔ فارن آفس میں نجم الثاقب بٹ پروفیسر تھے۔ جن سے مبارک شاہ بحر، وزن، قافیہ اور ردیف میں مشورہ اور اصلاح لیتے رہے۔

ادبی سفر

1990ء سے 1995ء کے دوران میں جب سیّد مبارک شاہ بسلسلہء ملازمت واہ کینٹ میں مقیم تھے تو وہاں "فانوسِ خیال" کے نام سے ایک ادبی تنظیم کام کر رہی تھی۔ جس کے اجلاس اکثر بے قاعدگی سے ہوا کرتے تھے۔ سیّد مبارک شاہ اور ان کے چند دوستوں ڈاکٹر رووٗف امیر مرحوم، ڈاکٹر وحید مشتاق، عصمت حنیف، شاہد مجید رانا اور حسن ناصر وغیرہ نے اس تنظیم کا نام بدل کر "صریر خامہ" رکھ دیا۔ جس کا باقاعدہ اور بھرپور اجلاس ہر منگل کو ہوتا تھا۔ ان اجلاسوں میں واہ کینٹ، ٹیکسلا، حسن ابدال اور راول پنڈی سے بہت سے لوگ شرکت کرتے تھے۔

مبارک شاہ کو دوست و احباب کا وسیع حلقہ میسر آیا جن میں ڈاکٹر سلیم اختر، امجد اسلام امجدؔ، ڈاکٹر خورشید رضویؔ، عباس تابشؔ، شکیل جاذبؔ، ڈاکٹر وحید احمد، محمود اسلم للّٰہ، شریف اعوان، ڈاکٹر مظہر الحق وغیرہ شامل ہیں۔

مبارک شاہ نے ایک بار بہاول پور کے چولستان ادبی فورم کے اجلاس میں بھی شرکت کی جہاں ڈاکٹر نجیب جمال اور ڈاکٹر اسلم ادیب جیسے لوگوں سے ان کی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ریڈیو پاکستان بہاول پور میں سیّد نعیم شاہ کو تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کا انٹرویو بھی دیا۔

سیّد مبارک شاہ کا کلام نامور ادبی رسائل "فنون" اور "ادبیات" میں چھپتا رہا ہے مگر وہ مشاعروں میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ میں مشاعروں کا شاعر نہیں۔ اُن کے بقول:

> "مشاعرے میں بات ایک مصرعے میں پورا نہیں ہوتا اور سامعین واہ واہ کر اٹھتے ہیں۔"3

مبارک شاہ پنجاب کے صوفی شعراء سے بہت متاثر رہے۔ میاں محمد بخش، بلھے شاہ، شاہ حسین، خواجہ فرید، بابا فرید گنج شکر، سلطان باہو، وارث شاہ جیسے نامور شعراء کے کلام کو بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اُن شعرا میں "میں" نہیں ہے۔

اردو شاعری میں مبارک شاہ ذوق اور غالب کی غزل گوئی سے متاثر تھے۔ شاعری میں اپنی پسند کے بارے میں مبارک شاہ خود رقم طراز ہیں:

> "میرے لیے اس بات کا فیصلہ محال ہے کہ کس شاعر سے کس حد تک متاثر ہوا ہوں۔ مجھے شکیب کی تڑپ، عدم کی مستی، ساغر کی قلندری، اقبال ساجد کی کاٹ، ناصر کاظمی کی اُداسی، فراز کے تغزل اور اظہار الحق کے استغنا سبھی نے متاثر کیا ہے۔ مجھے اچھی شاعری ہمیشہ اچھی لگتی ہے اس لیے میں جہاں مجید امجد اور اختر حسین جعفری کی نظموں کے سحر کا شکار ہوں وہاں وحید احمد کی نظم کے طلسم میں بھی گرفتار ہوں۔ اسی طرح غالب اور فیض کی غزلوں سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ میری اپنی غزل بھی میرے لیے معیار ہے۔"4

رحلت

سیّد مبارک شاہ 2007ء میں جوڑوں کے درد میں مبتلا ہوئے۔ 2013ء میں اس مرض نے شدت اختیار کرلی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ہائی بلڈ پریشر کے بھی مریض تھے۔ 26 جون 2015ء کی رات وہ شدید تکلیف میں رہے اور 27 جون کی صبح ان کے اہل خانہ انھیں سی۔ایم۔ایچ راولپنڈی لے کر گئے۔

> "ڈاکٹر نے بتایا کہ انھیں نمونیہ ہے اور اس کے علاوہ ہارٹ اٹیک کا شدید حملہ بھی ہوا۔ جس کی وجہ سے ان کا انتقال ہوگیا۔" 5

سیّد مبارک شاہ نے صرف 54 سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے جنازے کا وسیع اجتماع ان کی عظمت اور مقبولیت کی گواہی دے رہا تھا۔

"عوام الناس کا کہنا ہے کہ سینکڑوں افراد کا سمندر رواں دواں تھا اور یہ جنازہ راولپنڈی اور اسلام آباد کے بڑے جنازوں میں سے تھا۔"6

لاہور "پارک ٹی ہاؤس" میں سیّد مبارک شاہ (مرحوم) کی یاد میں 5 دسمبر 2015ء کو محفل کا اہتمام کیا گیا۔ جہاں آپ کے عزیز دوست محمود اسلم اللہ سمیت دیگر علمی و ادبی شخصیات شریک ہوئیں۔ اس محفل میں ان شخصیات نے شاہ کی وفات پر اظہار افسوس کیا اور ان کی موت کو اردو شاعری کے لیے ایک خلا قرار دیا۔ اس محفل میں محمود اسلم اللہ نے اپنے خیالات کا اظہار نہایت محبت و عقیدت سے کچھ یوں کیا:

"میں تو یہ فیصلہ بھی نہ کر سکوں کہ مجھے مبارک شاہ زیادہ عزیز ہے یا اس کی شاعری۔ لیکن یہ تب کی بات ہے لیکن آج آپ کے سامنے مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہو رہی کہ مجھے مبارک شاہ اس کی شاعری سے زیادہ عزیز ہے۔ اس کی شاعری سینکڑوں دلوں میں بستی ہے۔ اس کی شاعری بہت لوگوں کو عزیز ہے۔ مگر وہ عزیز از جاں تعلق تھا۔ اسے کیا نام دوں؟ اسے کیسے بھول جاؤں؟"7

اس کے علاوہ محمود اسلم اللہ کہتے ہیں کہ مبارک شاہ کی شاعری میں ان کی موت کا ذکر ملتا ہے۔ جس سے یوں لگتا ہے کہ وہ موت کی وارننگ دے رہے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں:

"مبارک شاہ کی شاعری سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسے اپنی عمر کے مختصر ہونے کا جیسے یقین ہو وہ جانتا تھا کہ اسے کرائے کا یہ مکان بہت جلدی خالی کرنا ہے۔

بدن میں میری جان کب تک رہے گا
کرائے کا مکان کب تک رہے گا
اتنے میں امتحان کی مہلت گزر گئی
سمجھے نہ تھے سوال کا پورا متن ابھی
8"

امجد اسلام امجد سیّد مبارک شاہ کی وفات کے بعد اپنے کالم میں لکھتے ہیں:

"ایسے بانکے، تیکھے، خیال افروز، فکر انگیز اور غیر معمولی جرات اظہار کے حامل اشعار کہہ سکنے والا مبارک شاہ اب ایک ایسے دربار میں پہنچ گیا ہے۔ جس کا

مالک خود اپنے بندوں کو بار بار غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ سو مجھے یقین ہے کہ وہاں اس کا استقبال ایک پسندیدہ مہمان کے طور پر ہو گا۔ البتہ جو بات اس نے ہاں پہنچ کر کرنی ہے۔ اس سے ایک شعر کی شکل میں وہ کچھ اس طرح سے کہہ سکتے ہیں۔

قیامت میں ذرا سا تخلیہ بھی
کہ تم سے بھی ہمیں کچھ پوچھنا ہے" 9

سیّد مبارک شاہ کی بڑی بہن نجمہ سیّد ان کی وفات پر افسوس کرتے ہوئے کہتی ہیں:

"ہم زندہ لوگوں کی قدر نہیں کرتے۔ مبارک شاہ ہمارے پاس پورا انسٹیٹیوٹ تھا ایک یونیورسٹی تھی۔"10

سیّد مبارک شاہ اب ہم میں نہیں۔ ان کی زندگی کی کہانی تو ختم ہو چکی ہے۔ لیکن آنے والے دور تک ان کی شاعری لوگوں کے دلوں میں زندہ رہے گی۔ اس ضمن میں محمود اسلم اللہ کہتے ہیں:

"مبارک شاہ نے جتنی معیاری، اچھوتی اور سحر انگیز شاعری کی ہے۔ مجھے اس کی تخلیق کے زندہ رہنے کے بارے میں کوئی وہم نہیں مگر وہ شخص، وجاہت، وہ اختلاف، وہ محبت، وہ محبتیں، وہ رفاقتیں اب کہاں؟ شاہ میں ان محبتوں کا قرض نہیں چکا پاؤں گا۔"11

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ سیّد مبارک شاہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کو مقام محمود تک پہنچا دے۔ (آمین)

سیّد مبارک شاہ کی کتب

شاعری (مطبوعہ)

جنگل گمان کے

ہم اپنی ذات کے کافر

زمین کو انتظار ہے (انتخاب)

مدار نارسائی میں

کلیات سیّد مبارک شاہ

نثر (مطبوعہ)

برگہ کی دھوپ میں (سفر نامہ)

نثر (غیر مطبوعہ)

سراب مستقیم (تحقیق / قرآنیات)

انا الحسین (مداج سے روحانی روابط)

"Never Again" Never (ایک یہودی مصنف کے جواب میں)

"جنگل گمان کے"

سیّد مبارک کی شاعری کا پہلا مجموعہ انیس ترانوے میں جنگل گمان کے کے نام سے شائع ہوا۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 1993ء میں جبکہ دوسرا 2010ء میں بک ہوم لاہور کے پلیٹ فارم سے شائع ہوا۔ شاعری کے اس مجموعے میں غزلیات اور نظمیں دونوں شامل ہیں۔ اس میں 52 نظمیں اور 56 غزلیات شامل ہیں۔ اس کتاب کے صفحات کی تعداد 160 ہے۔

اس کتاب کا انتساب حسین ابن منصور کے نام ہے۔ اس انتساب کے ساتھ یہ شعر بھی درج ہے:

آدم کی کسی روپ میں تحقیر نہ کرنا
پھرتا ہے زمانے میں خدا بھیس بدل کر

اس کتاب کا آغاز "تعارف کے عنوان سے ہوتا ہے جو خود سیّد مبارک شاہ کا تحریر کردہ ہے۔ "باعث تاخیر" کے عنوان سے اس کتاب کا دیباچہ محمود اسلم للّٰہ نے لکھا ہے۔

ہم اپنی ذات کے کافر

ہم اپنی ذات کے کافر سیّد مبارک شاہ کی شاعری کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن 1995ء میں شائع ہوا۔ جبکہ دوسرا ایڈیشن 2010ء میں بک ہوم لاہور نے شائع کیا۔ یہ

مجموعہ نظموں اور غزلیات پر مشتمل ہے جن میں 48 غزلیات اور 54 نظمیں شامل ہیں۔ اس کتاب کا انتساب مخاطب کے نام اس آیت قرآنی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

یا ایہا الانسان ما غرک بربک الکریم

کتاب کے آغاز میں یہ شعر بھی درج ہے۔

لوگ انبارِ طلب لے کے کھڑے تھے لیکن
ہم سے اک تیری تمنا بھی سنبھالی نہ گئی

اس مجموعے کا آغاز "دریافت" کے عنوان کے تحت لکھے گئے ایک مضمون سے ہوتا ہے۔ جس کے مصنف خود سیّد مبارک شاہ ہیں۔

مدارِ نارسائی میں

سیّد مبارک شاہ کی شاعری کا تیسرا مجموعہ مدار نارسائی میں کے نام سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ پہلی مرتبہ 1998ء میں الرزاق پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ نظموں اور غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس میں 53 نظمیں اور 33 غزلیات شامل ہیں۔ یعنی اس کتاب میں موجود کل تخلیقات کی تعداد 68 ہے۔ اس کتاب کی ضخامت 204 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا انتساب مبارک شاہ نے اپنی پیاری ماں کے نام کیا ہے۔ اس انتساب کے ساتھ یہ شعر بھی درج ہے۔

تمہارے بعد وقت پر ہر ایک شام ہو گئی
تمہارے بعد انتظار شام کا نہیں رہا

جدید اور مابعد جدید شاعری کی اگر ہم تعریف کریں تو شاید اردو شاعری میں سیّد مبارک شاہ کی شاعری کے موضوعات اس پر پورا اترتے ہیں۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیّد مبارک شاہ کی شاعری جدید یا مابعد جدید شاعری ہے۔ مبارک شاہ نے انسان، خدا، کائنات و حیات جیسے موضوعات کو موضوع سخن بنایا ہے۔ اس کا آغاز "مدارِ نارسائی میں" کے عنوان کے تحت لکھے گئے مضمون سے ہوتا ہے۔ جس کے مصنف خود سیّد مبارک شاہ ہیں۔

"مدارِ نا رسائی میں" کا دوسرا ایڈیشن 2010ء میں بک ہوم لاہور نے شائع کیا۔ پہلے ایڈیشن کی نسبت سے اس ایڈیشن میں کچھ اضافہ اور کچھ کمی کی گئی۔ اس ایڈیشن میں 39 غزلیات اور 59 نظمیں شامل ہیں۔ یوں اس میں تخلیقات کی مکمل تعداد 89 ہے۔ یہ کتاب 208 صفحات پر مشتمل ہے۔

زمین کو انتظار ہے

سیّد مبارک شاہ کی شاعری کا انتخاب " زمین کو انتظار ہے " کے نام سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ کلام 1995ء میں شائع ہوا۔ اسے فن سٹی پبلی کیشنز واہ کینٹ نے شائع کیا۔ اس کے مرتب شاہد مجید رانا ہیں۔ یہ مجموعہ 174 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مبارک شاہ کی 87 نظمیں شامل ہیں۔ اس کا انتساب "دریافت کرنے والوں کے نام" ہے۔ اس مجموعے کی ابتداء میں "آغاز" کے عنوان سے شاہد مجید رانا کا ایک مضمون شامل ہے۔ اس کے بعد "اقرار" کے عنوان کے تحت سیّد مبارک شاہ کی ایک تحریر بھی اس میں شامل ہے۔ نظموں سے قبل سورہ ن کی ابتدا "ن والقلم و مایسطرون" بھی لکھی گئی ہے۔

برگد کی دھوپ میں

سیّد مبارک شاہ شاعری کے ساتھ ساتھ نثر بھی انتہائی خوبصورت لکھتے ان کی نثر بھی ایسے ہی اچھوتی اور دلچسپ ہے جس طرح ان کی شاعری دلچسپ ہے انھوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر بھی لکھی۔ کیوں کہ وہ سی ایس پی تھے اس لئے انھیں کئی ممالک کا سفر بھی کرنا ہوتا تھا برگد کی دھوپ میں کے نام سے انھوں نے منیلا اور تھائی لینڈ کا سفر نامہ لکھا۔ یہ سفر نامہ پہلی مرتبہ 2000ء میں شائع ہوا۔ جبکہ دوسری مرتبہ 2010ء میں بک ہوم لاہور سے شائع ہوا۔ یہ سفر نامہ اس سے پہلے گوجرہ کے سہ ماہی رسالے "نزول" میں بھی قسط وار چھپتا رہا۔ اس رسالے کے مدیر سیّد اذلان شاہ تھے۔ اس سفر نامے کا انتساب گوتم بدھ کی بیوی "یشو دھرا" کے نام ہے۔ 'برگد کی دھوپ میں' منیلا اور تھائی لینڈ کا سفر نامہ ہے۔ جہاں بدھ مت کے کافی آثار پائے جاتے ہیں۔

ان کتب کے علاوہ سیّد مبارک شاہ نے تین کتابوں کے دیباچے بھی لکھے ہیں۔ جن میں رفعت سروش فیصل کی "نوائے سروش"، اعظم توقیر کی "چھوٹی سی غلط فہمی" اور شہزاد راؤ کی "میں کسی اور سلسلے میں ہوں" شامل ہیں۔

تحقیقی مقالہ جات

سید مبارک شاہ کی شاعری پر اس وقت تین مقالہ جات ایم اے کی سطح پر لکھے جا چکے ہیں۔ یہ مقالہ جات ان کی کتابوں پر ہونے والی انفرادی کام ہے۔

سید مبارک شاہ کی شاعری (جنگل گمان کے) کا تجزیاتی مطالعہ

یہ مقالہ سعدیہ عاشق نے ایم اے اردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے 2016ء میں شعبہ اردو نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد کے لیے لکھا۔ اس میں مقالہ نگار نے شعری مجموعہ جنگل گمان کے کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا۔

مدارِ نارسائی میں (سید مبارک شاہ) کا تجزیاتی مطالعہ

یہ مقالہ محمد ارشد، نے ایم اے اردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے 2012ء میں گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج، بہاول پور کے لیے لکھا۔ اس مقالہ میں سید مبارک شاہ کی غزلیات اور نظموں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا۔

سید مبارک شاہ کی شاعری مابعد جدید تناظر میں

یہ مقالہ کاشف علی نے ایم اے اردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے 2021 میں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد کے لیے لکھا۔ اس میں سید مبارک شاہ کی شاعری کو مابعد جدید شاعری قرار دیا گیا ہے۔

سیّد مبارک شاہ معاصرین کی نظر میں:

سید مبارک شاہ کی شخصیت اور فن پر ان کے سینئرز اور معاصر شعراء کے علاوہ نوجوان ناقدین نے بھی اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ ان میں میں سے چند آراء درج ذیل ہیں:

احمد ندیم قاسمی:

> "سیّد مبارک شاہ اردو کے ان چند نوجوان شعراء میں شامل ہیں جن کی طرف شاعری کا مستقبل بازو پھیلائے اور آنکھوں میں توقعات و امکانات کی شمعیں جلائے دیکھ رہا ہے۔ اس راہ میں اپنے ہم سفروں کی طرح وہ بھی بہت تیز تیز قدم اٹھا

رہے ہیں مگر ڈھارس یہ دیکھ کر بندھتی ہے کہ وہ ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھاتے ہیں۔ کہیں بھی اردو شاعری کی مثبت روایات سے بغاوت نہیں کی۔"12

امجد اسلام امجد:

"مابعد الطبیعات کے مسائل یوں تو مبارک شاہ کی ابتدائی شاعری میں بھی نمایاں تھے مگر گزشتہ کچھ عرصے سے تو یہ رنگ اس پر اس قدر غالب آگیا کہ اس کی عملی زندگی بھی اس سے واضح طور پر متاثر نظر آنے لگی تھی۔ بسیار گو تو وہ کبھی بھی نہیں تھا لیکن اب کم گوئی اور دروں بینی نے اس کے گرد ایک ایسا حصار کھینچ دیا تھا کہ وہ دنیا، اہل دنیا اور علائق دنیا سے بتدریج دور ہوتے ہوتے ایک ایسے عالم جذب و مستی میں رہنے لگا تھا جو روحانیت اور تصوف کے معروف انداز سے بالکل الگ ایک ایسے فلسفیانہ تفکر سے رشتہ آرا تھا۔ شاہ صاحب گویا ' سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے' کا عملی اور علمی نمونہ تھے۔ میں نے ان کو اپنے اندازے سے زیادہ گہرا پایا۔ ان کی ساری فکر کا محور خدا تھا۔ وہ اس پر گویا حق الیقین کے ساتھ ایمان رکھتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ بقول ان کے، وہ لڑتے بھی تھے، ناراض بھی ہوتے، سرگوشیاں بھی کرتے، گلے بھی کرتے، گویا لا ملجاء من اللہ الا الیہ والا حال تھا۔"13

غفور شاہ قاسم:

"سیّد مبارک شاہ کی نظم میں مواد، موضوع اور ہیت کی perfection موجود ہے۔ ان کی ہر نظم خیال کی نزاکت، احساس کی لطافت اور فنی گرفت کے حوالے سے قاری کو بھرپور انداز میں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ ان کا شعری سفر "جنگل گمان کے" سے لے کر "مدارِ نار سائی میں" تک پھیلا ہوا ہے"۔14

سلمان باسط:

"سچ تو یہ ہے کہ میرا دوست مبارک شاہ جتنا دلچسپ ہے اس سے بڑا شاعر اور اس سے کہیں برا انسان ہے۔ میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے اس کی محبت ملی ہے۔ ہم دونوں نے بے شمار ساعتیں ایک دوسرے کی معیت میں گزاری ہیں۔ کبھی روشن پرنور صبحوں میں، کبھی تپتی ہوئی دوپہروں میں، جب وہ میرے لیے ایک شجر سایہ دار ہوتا تھا۔ کبھی گرمیوں کی خوبصورت شاموں میں جب اس کا ساتھ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کی مانند تھا۔ کبھی راتوں کو جب آسمان پر ستاروں کے بجرے تیر رہے

ہوتے تو ہم دونوں بے شمار باتیں کرتے۔ سارے جہاں کی باتیں، ادب کی باتیں، سیاست کی باتیں، معاشرتی طبقات کی باتیں، معاشی عدم استحکام کی باتیں، اور وہ باتیں جو میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔ خدا کرے کہ اس دوستی کی چھاؤں گھنی رہے۔ اس کی خرگوش جیسی معصوم مسکراہٹ اسی طرح کھلی رہے۔ اس کے ماتھے پر لکھا ہوا سچ اسی طرح دمکتا رہے۔ اس کی آواز کی کھڑکھڑاہٹ میرے کانوں میں رس گھولتی رہے اور اس کی شاعری کا شکوہ الفاظ اسی طرح جاہ و حشم کے ساتھ قائم و دائم رہے۔"15

شاہد مجید رانا:

"سیّد مبارک شاہ نے اپنا دل کاٹ کر اپنے خون سے جیتے جاگتے شعر تخلیق کیے ہیں۔ رتجگوں میں اس نے جن خوابیدہ جہانوں کو کھوجا ہے ان کا بیان دریافت کرنا پڑتا ہے۔ جو کیفیت اس کی شاعری طاری کرتی ہے اس کے اظہار کے لیے لفظ ایجاد کرنے پڑتے ہیں۔"16

محمد ارشد:

"مبارک شاہ کی نظموں میں پرانی قدروں کا انہدام اور نئی قدروں کی تعمیر، اجنبیت، بے گانگی، بے سمتی، تنہائی، بے چارگی، کرب وسوسہ، تشکیک، اپنی ذات سے حتمی وابستگی، معتبر اور مسند وجود کی جستجو، ٹوٹتے بکھرتے رشتے، لمحوں کو گرفت میں لینے کی کوشش، شخصیت کا بکھرنا، جذباتی اور فکری نا آسودگی، آزادانہ جینے کی خواہش، ذمہ داریوں سے عہدہ بر آ ہونے کی تمنا اور دیگر کئی موضوعات فکری گہرائی اور قدرے منفرد اسلوب بیان کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔"17

سلیم طاہر:

"مبارک شاہ کے ہاں نظموں میں انسان اور کائنات کے رشتے کو اولین حیثیت حاصل ہے۔ مبارک شاہ نے عرفانِ ذات کی حدود کو عرفانِ کائنات کی حدود تک پھیلا دیا ہے"۔18

خرم جمیل:

"سائنس میں کہا جاتا ہے کہ ہر عمل کا ردِ عمل ہوتا ہے۔ وہ بھی مخالف سمت ہوتا

ہے۔ من و عن سیّد مبارک شاہ کی شاعری ہے۔ انھوں نے جس طرح محسوس کیا اور جو منظر بھی اُن کے پردہ تخلیق سے ٹکرایا تو انھوں نے اُسے ذرا مختلف اندازِ فکر اور اُنہی معنی کے ساتھ قارئین کیطرف لوٹا دیا"۔19

ڈاکٹر سلیم سہیل:

"مبارک شاہ کو کائنات کی ساری نہاں باتیں خود پر عیاں کرنے کا شوق ہے اور یہ شوق اُن کی شاعری میں بھی موجزن ہے وہ تصویر کا تیسرا رُخ دیکھنے کے بہت مشتاق ہیں۔ انھیں جوابات سے زیادہ سوالات ڈھونڈنے کا اشتیاق ہے۔ وہ اسی دنیا میں رہتے ہوئے کھلی آنکھ سے عقبیٰ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے فنا و بقا کا مسئلہ بھی ہمیشہ اُن کی آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔ زندگی، موت اور ان دونوں کے مختلف پہلو بار بار مبارک شاہ کو قلم اُٹھانے پر مجبور کرتے ہیں۔ مبارک شاہ کی تخلیقات بہت سے سوالات اُٹھاتی ہیں ان کا مخاطب انسان ہے وہ بار بار انسان سے اس کے افکار و اعمال کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ "20

ڈاکٹر شبیر حسن:

"کسی شاعر کا شعور اور فکر بہرحال اُس کی ذاتی زندگی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اچھی اور معتبر سطح پر ذاتی زندگی گزارنے والا ایسا فرد جس نے زندگی سے بہت کچھ اپنی محنت اور قابلیت کے بل بوتے پر حاصل کیا ہو۔ ہمیشہ معراجِ انسانی پر نظر رکھتا ہے اور شاید اسی لیے مبارک شاہ کو عظمتِ انسانی سے بے پناہ عقیدت ہے۔ خدا سے سوال و جواب اور کہیں کہیں بے حد محبت کے باوجود اسی مالکِ کون و مکاں سے اُلجھ پڑنے کا رویہ بھی مبارک شاہ کے ہاں نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ "21

عباس تابش:

"مبارک شاہ کے موضوعات بلاشبہ بڑے نادر اور آفاقی ہیں۔ جن میں قطعاً کہیں بھی سطحیت اور عامیانہ پن نظر نہیں آتا مبارک شاہ خود عوام میں سے نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے اپنے افکار کو بھی ہر جگہ پر عام سطح سے بلند رکھا۔ شاعری میں بار بار رگیدے جانے والے عام موضوعات کو اس کی شاعری چھُو کر بھی نہیں

گزری۔ اُس کے بارے میں بڑے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ عام بات کو جب تک کسی نکتہ آفرینی سے خاص نہ بنا لے مطمئن نہیں ہوتا۔"22

شرجیل بخاری:

سیّد مبارک شاہ کے لیے ایک نظم

دروغ صبح کاذب کی قسم کھا کر جو کہتا تھا
کہ اس کے خواب سچے ہیں
خدا کو چپکے چپکے روز خوابوں میں بلاتا تھا
نجانے وہ اسے کیا کیا بتاتا تھا
اسے شکوہ تھا یہ اہل جہاں
اپنے حواسوں سے الجھتے'ٹوٹتے'گرتے
پس دیوار زندان بدن لرزاں
یہ اپنی ذات کے کافر
خدا کی کیا گواہی دیں
اسے شکوہ تھا یہ ظاہر پرست اس کو
جگا دیتے ہیں خوابوں سے
خدا سے بات بھی کرنے نہیں دیتے!
اسے ہنگام محشر میں
خدا سے تخلیے میں پوچھنا تھا کچھ!
خدا سے پوچھتا تھا وہ
بتا کیا یاد ہے صبح ازل سے تا ابد معتوب وہ اپنا
وہ خود بین و خود آرا عظمت آدم کا منکر تھا

تمھارا کب وہ منکر تھا

مشیت اور رضا کے معرکے کا وہ شہید اولیں

جو جرات انکار کی پیغمبری کا آپ خاتم تھا

وہی جس نے تمھاری خود نمائی کے فسانے کا بھرم رکھا

جو اتنا بھی نہیں تھا جانتا الا خدا کیا ہے!

مبارک شاہ شاعر تھا بڑی عجلت میں رہتا تھا

نہ جانے کتنے نادیدہ جہانوں کا سفر درپیش تھا اس کو

وہ اس سرعت سے جیتا تھا

کہ اک پل میں کئی صدیوں کی گرد رہ اڑاتا تھا

اسے برگد کی دھوپ آواز دیتی تھی

وہ صدیوں کی مسافت سے

پلٹ کر آنے والی ان ہواوں سے یہ کہتا تھا

"مہکتے میٹھے مستانے زمانے ڈھونڈنے والو!

سبھی دکھ ہے

دکھوں کی اس گپھا میں گھر کے بھی

خوشیوں کا رستہ کھوجنے والو!

یہی دکھ ہے

عبث ہیں دستکیں ساری

جو اندر سے مقفل ہوں وہ دروازے نہیں کھلتے

سدھارتھ اپنے چوبارے سے نیچے اب نہ آئے گا"

اسے بغداد کی گلیوں میں اک دیوانہ ملتا تھا

شکستہ پا و درماندہ و مستغرق

خدا کو دیکھ کر خود میں

انا الحق کی صدا کرتا تو

فتووں اور کوڑوں کی زبانیں نوچتیں اس کو

زمانہ ساز لوگوں نے

اسی منصور کو سولی پہ لٹکا کر

بدن کے ریشے ریشے کو دھنک ڈالا

زمانہ دیر تک روتا رہا اس کو!

مبارک شاہ شاعر تھا

زمان و لامکاں کی بات کرتا تھا

جہاں دونوں گنوا کر تیسرے کی جستجو کرتا

ہر اک منظر کے باطن میں چھپی حیرانیوں کو روبرو کرتا

مجید امجد کی آنکھوں کی اداسی دیکھنے والا

وہ مٹی ڈھانپتے پھولوں کی پلٹن میں

بدن کو چھوڑ کر حیراں

حدود وقت سے آگے بہت آگے

خدا سے تخلیے میں بات کرنے کو

بڑی عجلت میں رخصت ہو گیا

سارے سوالوں کے جواب اس کو ملے ہوں گے

زمانوں کی مسافت کا جو حاصل ہے تو اتنا ہے

خدا سے بات کرتا تھا

خدا سے بات کرتا ہے!!!

ڈاکٹر احتشام علی:

"عموماً ایک عالم آدمی کا علم اس کے تخلیقی کام میں بھی اپنا زور جمانے لگتا ہے جس کی وجہ سے شعر جذبات کی نرم ونازک سرزمینوں سے فرار اختیار کر کے کھردرے رستوں کا تعین کر لیتا ہے یہ کھردرا پن غزل سے اس کا حسن چھین لیتا ہے یہ دراصل تخلیق کار کی کمزوری ہوتی ہے کا وہ اپنے علم کو اپنے فن پر حاوی کر لیتا ہے ایسے میں کوئی تخلیق کار اگر اپنے فن کو علم پر حاوی کر لے تو اس کے شعر دو طرفہ مزا دیتے ہیں، مبارک صاحب کا فن ان کی علمی صلاحیتوں پر ہمیشہ حاوی رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان فکر سے بھرپور شعر بھی شعریت سے مالا مال ہوتا ہے" 23

پروفیسر احمد عطا:

"تصوف ایک ایسا موضوع ہے جو خیال کی وسعت کے ساتھ ساتھ وسیع مطالعے کا بھی متقاضی ہوتا ہے۔ مبارک صاحب کے ہاں تصوف کا موضوع ایسی روانی کے ساتھ در آیا ہے کہ کہیں بھی شعر اپنی شعریت سے نکل کر علمیت کے روکھے پن میں داخل نہیں ہوتا۔ تصوف کا تصور بھی مختلف ادیان کے ساتھ ساتھ بدلتا جاتا ہے مگر مبارک صاحب کے تصوف ادیان کی حد بندیوں سے بالا تر ہو کر آفاقیت کو چھونے لگتا ہے" 24

ڈاکٹر عثمان ضیاء:

"سیّد مبارک شاہ کا شعر اپنے قاری سے باشعور اور عالم ہونے کا تقاضا ضرور کرتا ہے مگر ایسا ہرگز نہیں کی قاری شعر کی تہ تک نہ پہنچ سکے لیکن ان کا شعر قرات کے بعد قاری میں فکری بھونچال ضرور پیدا کرتا ہے۔ قاری کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ

جاتی ہیں۔ قاری کیدیہ حیرت اکثر اس وجہ سے ہوتی ہے کہ کسی بھی شے کو اس
زاویے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے جس زاویے سے مبارک شاہ دیکھ رہے ہیں۔"25

حوالہ جات

1۔ سعدیہ عاشق،سیّد مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ(مقالہ برائے ایم اے اردو)، مملوکہ شعبہ اردو نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، 2014-2016،، ص14

2۔ ایضا"ص14

3۔ ایضا"ص11

4۔ مبارک شاہ، سیّد ، کلیات سیّد مبارک شاہ ، جہلم بک کارنر، جہلم، 2017، ص13

5۔ سعدیہ عاشق،سیّد مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ(مقالہ برائے ایم اے اردو)، مملوکہ شعبہ اردو نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، 2014-2016، ص24

6۔ ایضا"

7۔ محمود اسلم للہ، تاثرات، غیر مطبوعہ مضمون، تعزیتی تقریب بیاد سیّد مبارک شاہ، پاک ٹی ہاؤس، لاہور 5 دسمبر 2015

8۔ ایضا"

9۔ امجد اسلام امجد، روزنامہ ایکسپریس، گوجرانوالہ، بروز جمعرات، 11 جولائی 2015ء

10۔ سعدیہ عاشق،سیّد مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ(مقالہ برائے ایم اے اردو)، مملوکہ شعبہ اردو نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، 2014-2016،، ص26

11۔ للہ، محمود اسلم، تاثرات، غیر مطبوعہ مضمون، تعزیتی تقریب بیاد سیّد مبارک شاہ، پاک ٹی ہاؤس، لاہور 5 دسمبر 2015

12۔ سعدیہ عاشق،سیّد مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ(مقالہ برائے ایم اے اردو)، مملوکہ شعبہ اردو نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، 2014-2016،، ص26

13۔ امجد اسلام امجد، روزنامہ ایکسپریس، گوجرانوالہ، بروز جمعرات، 11 جولائی 2015ء

14۔ غفور شاہ قاسم، پاکستانی ادب، شناخت کی نصف صدی، ریز پبلی کیشنز، راولپنڈی 2000ء

15۔ سلمان باسط، خاکی خاکے، استعارہ پبلی کیشنز، اسلام آباد، 1999ء، ص86

16۔ رانا، شاہد مجید، دیباچہ، زمیں کو انتظار ہے، فن سٹی پبلی کیشنز، راولپنڈی،، 1995ء، ص 12

17۔ محمد ارشد، مدارِ نارسائی میں (سیّد مبارک شاہ)کا تجزیاتی مطالعہ، مقالہ ایم اے اردو مملوکہ گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج، بہاول پورِ، 2012ء، ص21

18۔ سلیم طاہر، انٹرویو، راقم، لاہور، بدھ، 5 جون 2019ء، دن گیارہ بجے

19۔ محمد ارشد، مدارِ نارسائی میں (سیّد مبارک شاہ)کا تجزیاتی مطالعہ، مقالہ ایم اے اردو مملوکہ گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج، بہاول پورِ، 2012ء، ص69

20۔ سلیم سہیل، ڈاکٹر، انٹرویو، از راقم، ہفتہ 4، مئی 2019ء، دن دو بجے

21۔ شبیر حسن، ڈاکٹر، انٹرویو از راقم، اتوار، 9 فروری 2020ء، رات 8 بجے

22۔ عباس تابش، انٹرویو از راقم، منگل، 3 مارچ 2020ء، رات 10 بجے

23۔ احتشام علی، ڈاکٹر، انٹرویو از راقم، جمعہ، 10 مئی 2019ء، رات 9 بجے

24۔ احمد عطاء، انٹرویو از راقم، ہفتہ، 11 مئی 2019ء، دن 2 بجے

25۔ عثمان ضیاء، ڈاکٹر، انٹرویو از راقم، منگل، 11 مئی 2019ء، دن 3 بجے

باب دوم

سیّد مبارک شاہ کی شاعری میں تصوف

سیّد مبارک شاہ کی شاعری میں تصوف کا موضوع

"تصوف" کا بطور موضوع شاعری میں استعمال اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود تصوف۔ انسان نے جب سے لکھنا شروع کیا اور شاعری کا آغاز ہوا تو دوسرے بہت سے موضوعات کے ساتھ تصوف بھی اس کے تصرفات میں آیا۔ دراصل انسان کو درپیش اولین سوالات میں سب سے اہم سوال اس کی شناخت کا تھا اسی سوال کے بطن سے بنانے والے یعنی خدا کا سوال وجود میں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب جب انسان نے اپنی شناخت کھوجنے کی کوشش کی وہ کائنات کے خالق کی دریافت کی کاوش بھی کرتا رہا۔ شاعری نے اسی ماحول میں جنم لیا جب انسان چند بنیادی سوالات کے جوابات ڈھونڈ رہا تھا۔ یہ البتہ دلچسپ معاملہ ہے کہ ان چند سوالات کو حل کرتے کرتے کئی نئے سوالات پیدا ہوئے بلکہ ان کے جوابات بھی تلاش کر لیے گئے۔ انسان اپنی اور خدا کی تلاش میں کہکشاؤں تک سے جا الجھا مگر بقول اقبال:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

اردو شاعری میں بھی تصوف کے موضوعات قلی قطب شاہ سے ولی دکنی، میر سے غالب، اقبال سے آج تک کے شعراء میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ آپ کسی بھی جدید یا معاصر شاعر کی کتاب اٹھالیں چاہے محض روایتی طور پر ہی سہی تصوف کا تذکرہ کہیں نہ کہیں ضرور ملے گا۔ البتہ تصوف کو شعوری طور پر بطور خاص اردو میں کم شعراء نے برتا ہے۔ زیادہ تر شعراء کے یہاں "تصوف برائے شعر گفتن" ہی رہا اور روایت کے زیر اثر کچھ شاعری لکھی گئی جیسے خمریات کے متعلق کم از کم چند اشعار آپ کو تمام شعراء کے یہاں مل جائیں گے جو کہ محض غزل کی روایت کے پیش نظر شاعری میں درآتے ہیں۔ محمد طیب ابدالی کہتے ہیں:

> "یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اردو شاعری تصوف کے بغیر بے جان ہے یعنی قالب تو ہے لیکن روح نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کی ابتداء کے ساتھ ہی تصوف کے خیالات و افکار بھی داخل ہوتے رہے۔ قدیم شعراء کسی نہ کسی شکل میں مسائل

تصوف پر غور و فکر کرتے رہے اور اپنے تجربات و مشاہدات کو بھی شعری جامہ پہنایا۔"1

اردو شاعری میں چند ہی ایسے شعراء ہیں جنھوں نے تصوف کا بنیادی موضوع کے طور پر پیش کیا۔ سر دست میر درد اور اقبال کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ میر و غالب کے یہاں بھی تصوف اہم موضوع کے طور پر سامنے آتا ہے لیکن درد اور اقبال کے یہاں یہ بنیادی موضوعات میں سے ایک ہے۔

سیّد مبارک شاہ کے یہاں بھی تصوف بنیادی موضوع ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ ان کی شاعری کا مرکزہ ہے۔ اسی کے گرد ان کے تمام موضوعات گھومتے ہیں۔ وہ خدا کی تلاش میں ہی آسمانوں اور کہکشاوں کو کھوجتے ہیں اور پھر زمین پر بسنے والے انسانوں میں ہی خدا ڈھونڈنے لگ جاتے ہیں۔

انساں کے کسی روپ کی تحقیر نہ کرنا
پھرتا ہے زمانے میں خدا بھیس بدل کر
(جنگل گمان کے)

سیّد مبارک شاہ کی شاعری میں تصوف کے موضوعات کو ہم دو بنیادی موضوعات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

1۔ تصور خدا

2۔ تصور انسان

خدا اس واسطے بھی ہے ضروری
کہ اس کے دم سے میری شاعری ہے
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص299

سیّد مبارک شاہ کے یہاں دراصل خدا اور انسان ایک ہی وجود کے دو نام ہیں۔ وہ کہیں نہ کہیں فلسفہ وحدت الوجود کے قائل نظر آتے ہیں۔ وہ انسان اور خدا کی دریافت ایک ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ معرفت نفس سے معرفت خدا کرنا چاہتے ہیں بقول سلطان ناصر: "سیّد مبارک شاہ کی شاعری کا مرکزی موضوع خدا اور انسان کا تعلق ہے"۔ 2اس کے علاوہ وہ کئی شخصیات سے متاثر

نظر آتے ہیں جن میں سقراط، گوتم بدھ، امام حسین اور حسین بن منصور حلاج نمایاں ہیں بلکہ ان کی شاعری میں بالواسطہ اور بلاواسطہ ان شخصیات کا تذکرہ ملتا ہے۔ان سب سے وابستگی تصوف ہی کے موضوع سے وابستگی کی دین ہے۔ان شخصیات کے اثرات کا تذکرہ بھی اس باب کے آخر میں کیا جائے گا۔

تصور خدا

اسلامی اور غیر اسلامی تصوف کی اصطلاحات سے پہلے بھی تصوف کا بنیادی معاملہ خدا کی تلاش تھا۔جیسا کہ پہلے تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ انسان نے جب سے سوچنا شروع کیا اس نے اپنی اور خدا کی دریافت کا سفر بھی شروع کر دیا۔ تخلیق کو سمجھنے کے لیے خالق کو جاننے کی روایت تب سے چلی آرہی ہے۔(آج بھی کسی تحریر کو سمجھنے کے لیے تخلیق کار کو سمجھنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ اب تعبیر متن کے لیے متن کو بنیادی حیثیت دی جانے لگی ہے لیکن ساختیات ، پس ساختیات اور رد تشکیل کے دور میں چاہتے ہوئے بھی تخلیق کار کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکا۔ بقول ارشد محمود:

> "معلوم انسانی تاریخ سے لے کر آج تک انسانوں کی کوئی ایسی بستی نہیں ملی جہاں مافوق الفطرت ہستی کا تصور موجود نہ رہا ہو۔مختلف ادوار اور مختلف جغرافیائی خطوں کی ثقافت میں انسان نے اپنے شعور اور علمی سطح کے مطابق خدا کے بے شمار نظری اور مادی روپ تراشے۔"3

انسان نے اس دریافت کے عمل میں خالق کو ہمیشہ عزت و توقیر کے منصب پر بٹھایا اور سیّد مبارک شاہ کے یہاں تب سے اب تک کا انسان، گو جس بھی مذہب کا ماننے والا ہو ،اسی ہستی کو معبود تصور کرتا رہا۔

انساں کسی بھی دور میں مشرک کبھی نہ تھا
پتھر کے نام پر بھی تجھے پوجتا رہا
جنگل گمان کے ص78

اس سلسلے میں سیّد مبارک شاہ اپنے اس سفر میں دیگر صوفیاء سے فکری راہنمائی ضرور لیتے ہیں مگر اپنی دنیا آپ تلاش کرنے کے قائل ہیں۔وہ محض اندھی تقلید کو جہالت گردانتے ہیں۔یہی

وجہ ہے کہ آپ کو ان کی شاعری میں جا بجا قرانی حوالے نظر آئیں۔ انھوں نے قرآن کے متن کو سمجھنے کی خود کوشش کی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض نظریات پر قارئین تحفظات بھی رکھتے ہیں لیکن اس کی وجہ سیّد مبارک شاہ کی وہ فنی دیانت ہے جس کے باعث وہ یہ مشکل راہ چنتے ہیں۔

بکمیش زندہ دلاں زندگی جفا طلبیست
سفر بکعبہ نہ کردم کہ راہ بے خطر است
پیام مشرق

بقول سلطان ناصر:

"ان کے یہاں تصوف برائے شعر گفتن نہیں بلکہ ایک ذاتی تجربہ اور ایک واردات ہے۔ لہٰذا انھیں کہی سنی باتیں دہرانے سے کچھ دلچسپی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا نقطہ نظر روایتی متصوفین کو ہضم نہیں ہوتا۔"4

دراصل سیّد مبارک شاہ اس نظریہ کا قائل ہیں جیسا قرآن مجید کائنات پر غور و خوض کرنے کی ترغیب دیتا ہے تو قاری کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے تئیں کائنات کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ محض چونکانے کے لیے وہ ان موضوعات کا استعمال جائز سمجھتے ہیں۔ وہ اسی Poetic License کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"چونکہ شاعر کے پاس Poetic License ہوتا ہے جسے وہ خود ہی جاری کرتا ہے اور خود ہی Renew اس لیے اس کے لیے ناگفتنی بھی قابل گفتار ہو جاتی ہے مگر ناقابل گرفت کیوں کہ حقیقت یہ ہے کہ لوگ شاعری کو سنجیدگی سے نہیں لیتے۔"5

مے سی حسین شے اور واقعی حرام
میں کثرت شکوک سے گھبرا کے پی گیا
کلیات عبدالحمید عدم

وہ عدم کے اس مشہور شعر پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے سفر نامے میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"جس شعر پر عدم کو داد ملی تھی اس کی نثر پر انھیں کوڑے بھی لگ سکتے تھے۔ اسی طرح شاعری میں ہم نے جنونیالات کا اظہار کیا اسے نثر میں لکھنے کا انجام معلوم

ہے۔۔۔ مگر انصاف کا تقاضا ہے کہ اسے نثر میں بیان کرنے کی ہمت بھی ہونی
چاہیے۔ کوڑے کھانے کا خوف اپنی جگہ مگر سچ کا ابلاغ اسی طرح ضروری ہے۔"6

دراصل شاعری میں یہ موضوعات اتنے پٹ چکے ہیں کہ ان پر بات کرنا کلیشے سمجھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ کوئی انھیں سنجیدہ نہیں لیتا۔ پوری اردو شاعری واعظ کے خلاف استغاثے کا مقدمہ لگتی ہے لیکن چوں کہ محض برائے شعر گفتن ہے اس لیے خود واعظ کو بھی کبھی نہیں کھٹکی۔ اس طرح واعظوں کے یہاں بھی خدا محض منبر پر خطاب کرنے کا ایک موضوع بن کر رہ گیا ہے۔ اس بات کا ادراک سیّد مبارک شاہ کو بھی ہے۔ وہ ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''واعظوں اور خطیبوں نے مذہب کو بد نام کیا تو شاعروں نے شاعری کو رسوا کر دیا.
بات طویل ہوگئی مگر کہنا یہ مقصود تھا کہ سنجیدہ بات کہنے کے لیے کبھی کبھار شاعری
کا میڈیم کچھ زیادہ موزوں نہیں لگتا۔" 7

دراصل وہ محض اس وجہ سے شاعری سے متنفر نظر آتے ہیں کہ ان کے خیال میں ایسے سنجیدہ موضوعات لوگ شاعری میں اول تو پڑھنا نہیں چاہتے اور اگر پڑھنا بھی چاہتے ہیں تو اس سے محض شاعری سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود سیّد مبارک شاہ شاعری میں یہ تمام موضوعات بیان کرتے ہیں شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں اور شاعری میں انھیں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے میں زیادہ آسانی محسوس ہوتی ہے۔ حالانکہ مندرجہ بالا بیان سے یہ بات واضح ہے کہ شاعری میں ان موضوعات کے استعمال کی وجہ سے قاری کے دل میں نظر انداز کیے جانے کے کھٹکے سے آگاہ ہیں لیکن اس کے باوجود وہ شعر میں ان موضوعات پر بلا جھجک بات کرتے ہیں.

سیّد مبارک شاہ اور اقبال

خدا سے سیّد مبارک شاہ کا تعلق اقبال سے بالکل مختلف ہے۔ اقبال کے ہاں خدا کا تصور ایک عظیم الشان ہستی کا ہی رہتا ہے۔ دامن یزداں چاک کر دینے والا اقبال ہمیں بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ لیکن سیّد مبارک شاہ کا انسان خدا سے برابری کی سطح پر بات کرتا ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ انھوں نے یہ لہجہ خود اقبال سے سیکھا ہے۔ اپنی پہلی کتاب 'جنگل گمان کے' میں انھوں نے کئی شعرائے کرام کے نام اس بابت درج کیے کہ وہ ان سے متاثر ہیں لیکن اس فہرست میں اقبال کا نام شامل نہیں کیا۔ لیکن اس دیباچے کے اختتام پر ایک نوٹ میں وہ رقم طراز ہیں:

''میں نے اپنی اس فہرست میں اقبال کا کہیں حوالہ نہیں دیا۔ جو بہت زیادہ قریب ہو بعض اوقات آنکھ کے احاطے میں نہیں آتا۔ یہی معاملہ میرا اقبال کے ساتھ ہے۔''8

سیّد مبارک شاہ خدا سے جب مخاطب ہوتے ہیں تو وہ استغاثہ پیش کرتے ہیں مگر مکالمہ نہیں کرتے یعنی ان کے یہاں یہ گفتگو یک طرفہ ہوتی ہے۔ وہ خدا کے ساتھ شکوہ کناں نظر آتے ہیں مگر کسی جواب کی تمنا کیے بغیر اپنی گفتگو کو ختم کر دیتے ہیں۔ یعنی وہ محض سوالات اٹھانے تک کے قائل ہیں انھیں ان کے جوابات تلاش کرنے سے زیادہ دلچسپی معلوم نہیں ہوتی۔ جیسا کہ سلطان ناصر اپنے مضمون میں کہتے ہیں:

''سیّد مبارک شاہ کے اس رویے کو اگر کلام اقبال کے تناظر میں دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ شاہ جی کا تخاطب 'شکوہ، جواب شکوہ' سے اس بنا پر مختلف ہے کہ وہاں انسان جواب پالیتا ہے مگر یہاں بات سوالیہ نشان پر ختم ہوتی ہے (مگر ختم ہوتی ہی کہاں ہے)۔''9

سیّد مبارک شاہ کے یہاں تخاطب کا یہ لہجہ اس وجہ سے بھی اقبال سے مختلف ہے کہ وہ اس معاملے میں ابن حلاج سے بہت متاثر ہیں۔ اپنی شاعری میں ابن حلاج کے بار بار ذکر کرنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے (اس پر تفصیلی بات منصور بن حلاج کے ذیلی عنوان کے تحت کی جائے گی)۔

ابلیس کا کردار

الٰہیات کے موضوع پر اقبال اور سیّد مبارک شاہ کے اختلاف رائے کو دونوں شعرا کی ابلیس پر لکھی گئی نظم کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ سیّد مبارک شاہ کے یہاں ابلیس کا تذکرہ بھی خدا سے گفتگو کے دوران آتا ہے۔ کبھی وہ خود ابلیس کا مقدمہ خدا کے حضور پیش کرتے ہیں اور کبھی ابلیس کو خدا سے ہم سخن کرا دیتے ہیں۔ حالاں کہ اقبال بھی ابلیس کے جذبۂ عشق کو سراہتے ہیں اور اسے 'خواجۂ اہل فراق' کا خطاب بھی دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود اقبال کے یہاں ابلیس ایک منفی کردار کے طور پر ہی سامنے آتا ہے۔ 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' اور 'جبریل و ابلیس' میں گو کہ اقبال ابلیس کو ایک مضبوط اور طاقت ور کردار کے طور پر پیش کرتے ہیں لیکن ہر دو جگہ اس کا تکبر اور گھمنڈ بھی واضح کرتے ہیں جس سے اس کے ارتداد میں فرق نہیں آتا۔ مثلاً جبریل و ابلیس میں ابلیس جب جبریل سے کہتا ہے:

خضر بھی بے دست و پا ، الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم ، دریا بہ دریا ، جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصہء آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو !
میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ھو ، اللہ ھو ، اللہ ھو

کلیات اقبال

ابلیس کی اس گفتگو میں نخوت اور نفرت واضح محسوس کی جاسکتی ہے۔اقبال ابلیس کو جہاں ناقابل شکست بھی دکھاتے ہیں تو قاری کو اس کی محبت میں مبتلا نہیں ہونے دیتے۔لیکن سیّد مبارک شاہ کے یہاں ابلیس کے بارے میں رویہ کچھ دوستانہ ہے۔وہ دراصل ابلیس کو ابن حلاج کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ان کے یہاں ابلیس سے محبت تو نہیں ہوتی مگر گونا ہمدردی ضرور محسوس ہوتی ہے۔مثلاً اپنی نظم 'الا ابلیس' میں لکھتے ہیں:

''جس نے مٹّی کے بُت کو نہ سجدہ کیا
روزِ اوّل سے جو منکرِ شرک تھا
جز ترے جس کی نظروں میں کوئی نہ موجود تھا
تیرا مردُود تھا؟
جس کے پیشِ نظر تیری تقدیس تھی
کس قدر وُسعتِ ظرفِ ابلیس تھی
سینہء آدمی کا ہر اک وسوسہ
جس سے منسوب تھا
تیرا معتوب تھا؟
ہے تو ہو گا، مگر مُنصفِ دوجہاں!
اُس کے دل کی خَلِش کس کے سر جائے گی

جس نے ہر حال میں تیری لوحِ ازل کا بھرم رکھ لیا

جس نے تیرے لیے بے طلب راستوں پر قدم رکھ لیا''

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص158

اس طرح اپنی ایک اور نظم 'ایک ناگفتہ مکالمہ' میں وہ پھر سے خدا سے ابلیس کا مقدمہ لڑتے ہیں۔

''تمہارے واسطے ہم نے

اسے ٹھکرا دیا جس نے

عبادت میں تدبر کی طرح ڈالی

ابھی جس کی ریاضت کے تعین کے لیے

نوری زمانوں کے بھی پیمانے ادھورے ہیں

عبادت کو اطاعت سے ممیز کر گیا باغی

تمہاری ذات کا کافر

ہمارا تو نہ منکر تھا نہ مشرک تھا''

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص197

ان دونوں نظموں میں سیّد مبارک شاہ نے ابلیس کو ایک مظلوم اور معصوم کردار کے طور پر پیش کیا ہے۔ ابلیس کا مقدمہ انھوں نے نظم "نہ جانے اسے کس نے آواز دی تھی" میں بھی بخوبی لڑا ہے جس میں حسین بن منصور حلاج اور جنید بغدادی کے مابین مکالمہ ہے۔ ادبیات اردو میں شاید ابلیس کو ایک مثبت کردار کے طور پر پیش کرنے والے سیّد مبارک شاہ پہلے شاعر ہیں۔ لیکن وہ اللہ کے فیصلے کو چیلنج نہیں کرتے بلکہ محض ایک سوال اٹھاتے ہیں۔ اور اس کردار کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس بارے میں سلطان ناصر کہتے ہیں:

'' اس امر میں تو بحث ہو سکتی ہے کہ ابلیس کا اصل مقام کیا ہے مگر اس میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ سیّد مبارک شاہ نے ابلیس کی تصویر میں بے مثال رنگ بھر کر ادبیات میں اس کردار کو حیات نو عطا کی ہے۔ ابلیس شاہ جی کا tragic hero

ہے جو اپنے hamartia کے باوجود نہ صرف قاری کو متاثر کرتا ہے بلکہ اس کے catharsis کا باعث بھی بنتا ہے۔''10

گویا سیّد مبارک شاہ ابلیس اور خدا کے تعلق کو از سر نو جانچنے کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ابلیس بھی خدا کے وسیع منصوبے (Larger Plan) کا حصہ ہے۔ بقول ارشد محمود:

"کہکشاؤں کی دنیا سے لے کر ایٹم کی خوردبینی دنیا تک ہر جگہ اور ہر آن تعمیر و تخریب کا عمل یکساں نظر آتا ہے۔ چنانچہ کیا ایسا نہیں ہے کہ 'شیطان' اور 'خدا' ناگزیر طور پر ایک دوسرے کے وجود سے وابستہ ہیں۔"[11]

حسین بن منصور حلاج اور وحدت الوجود

محی الدین ابن عربی کے فلسفہ وحدت الوجود کو ہندوستان کے شعراء کے ہاں بالعموم اور صوفیاء کے ہاں بالخصوص موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ چاہے یہ تصوف برائے شعر گفتن کا معاملہ ہی کیوں نہ ہو ہمارے کلاسیکی شعرا سے لے کر دور حاضر کے اہم شعراء تک یہ موضوع ہمیں کثرت سے ملتا ہے۔

خواجہ میر درد کا شعر ہے:

مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں
ہم آئنے کے سامنے جب آکے ہُو کریں

ارشد محمود لکھتے ہیں:

"وحدت الوجودی فلسفے سے عالمی ادب ہمیشہ متاثر رہا ہے۔ ادیب اور شاعر عموماً شعوری اور غیر شعوری طور پر وحدت الوجودی تصور خدا سے متاثر ہو کر لکھتے رہے ہیں۔"12

وحدت الوجود ایک صوفیانہ فلسفہ ہے جس کی رو سے جو کچھ اس دنیا میں نظر آتا ہے وہ خالق حقیقی کی ہی مختلف شکلیں ہیں اور خالق حقیقی کے وجود کا ایک حصہ ہے۔ گویا پوری کائنات خدا کا روپ ہے۔ کائنات میں موجود تمام اشیاء اس ایک مکمل وجود کا حصہ ہے۔ گویا ہم سب خدا کا جزو بدن ہیں ۔ اس عقیدے کا اسلام کی شریعتی اساس سے کوئی تعلق نہیں، قران و حدیث میں اس کا کوئی حوالہ نہیں ملتا اور کچھ مسلمان علما اس عقیدے کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ چونکہ اس عقیدے کی

ابتدا مسلم صوفیا کے یہاں سے ہوئی اس لیے اسے اسلام سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ مسلمان صوفیاء نے اسے وحدت الوجود کا نام دیا جب کہ اس سے پہلے یہ فلسفہ کسی نہ کسی شکل میں ہندومت اور بدھ مت میں بھی پایا جاتا تھا۔ ہے یہ عقیدہ ہر زمانے میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا، ہندومت کے عقیدہ اوتاربدھ مت کے عقیدہ نروان اور جین مت کے ہاں بت پرستی کی بنیاد یہی فلسفہ وحدت الوجود اور حلول ہے۔ (یہودی اسی فلسفہ حلول کے تحت حضرت عزیر علیہ السلام اور مسیحی عیسٰی علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا (جزو) قرار دیتے ہیں۔ ارشد محمود اپنی کتاب "تصور خدا" میں رقم طراز ہیں:

> " مروجہ تصور، خدا کو خالق کائنات قرار دیتا ہے جس کا ہم خود بھی حصہ ہیں۔ گویا خالق اور مخلوق دونوں الگ الگ ہستیاں ہیں۔ خالق اور مخلوق کی یہ دوئی خدا کو ناگزیر طور پر محدود ہستی کا درجہ دے دیتی ہے۔ ایک طرف خالق اور دوسری طرف مخلوق۔ اس طرح خدا ایک متعین شے بن جاتا ہے لیکن اگر خدا کو لامحدود (Infinite) مان لیا جائے تو پھر خدا اور کائنات دونوں الگ الگ نہیں ہو سکتے۔ محدود کا لامحدود میں ضم ہونا ناگزیر ہے۔"13

کچھ لوگ یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ انسان عبادت وریاضت کے ذریعے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اسے کائنات کی ہر چیز میں اللہ نظر آنے لگتا ہے یا وہ ہر چیز کو اللہ کی ذات کا جزو سمجھنے لگتا ہے اس عقیدے کو بھی وحدت الوجود کہا جاتا ہے۔ عبادت اور ریاضت میں ترقی کرنے کے بعد انسان اللہ کی ہستی میں مدغم ہوجاتی ہے اور وہ دونوں (خدا اور انسان) ایک ہو جاتے ہیں، اس عقیدے کو فنا فی اللہ بھی کہتے ہیں، عبادت اور ریاضت میں مزید ترقی سے انسان کا آئینہ دل اس قدر لطیف اور صاف ہوجاتا ہے کہ اللہ کی ذات خود اس انسان میں داخل ہوجاتی ہے جسے حلول کہا جاتا ہے۔ ان تینوں اصطلاحات کے الفاظ میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہے لیکن نتیجہ کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں اور وہ یہ ہے کہ انسان اللہ کی ذات کا جزواور حصہ ہے۔

اہل شریعت اس معاملے میں سخت موقف رکھتے ہیں۔ وہ اس عقیدے کو قران و حدیث کے منافی قرار دیتے ہیں۔ مولانا عبد الرحمٰن کیلانی لکھتے ہیں:

> "انسان چلہ کشی اور ریاضتوں کے ذریعہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اسے کائنات کی ہر چیز میں خدا نظر آنے لگتا ہے، بلکہ وہ ہر چیز کو خدا کی ذات کا حصہ سمجھنے لگتا ہے، اس قدر مشترک کے لحاظ سے ایک بدکار انسان اور ایک بزرگ، ایک درخت

اور ایک بچھو، لہلہاتے باغ اور ایک غلاظت کا ڈھیر سب برابر ہوتے ہیں، کیونکہ ان سب میں خدا موجود ہے۔" 14

سیّد مبارک شاہ کے ہاں 'خدا' بنیادی موضوع ہے۔ وہ اپنی شاعری میں خدا سے مکالمہ کرتے جا بجا نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کے یہاں وحدت الوجود کا مسئلہ کسی نہ کسی طرح حسین بن منصور حلاج سے جڑا ہے۔ سیّد مبارک شاہ، حسین بن منصور حلاج سے عقیدت اور وابستگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ حلاج کی شخصیت اور فلسفہ پر ایک کتاب کا مسودہ تیار کر چکے تھے مگر بوجوہ اسے نہ چھپوا سکے۔ راقم الحروف جب ان کی فیملی کا انٹرویو کرنے ان کے گھر پہنچا تو ان کی ذاتی لائبریری سے حلاج کی معروف کتاب 'کتاب الطواسین' نظر آئی۔ اس کتاب کے حاشیوں میں جا بجا سیّد مبارک شاہ نے نوٹس لکھے ہوئے تھے۔ ان کی کئی نظموں کے مصرعے اور حوالے بھی تحریر تھے۔ اس کتاب کے حوالے سے سیّد مبارک شاہ اپنی نظم "اپنی شاعری پر تبصرہ" میں لکھتے ہیں:

مرا اپنا مرشد آگہی

جو زمانے بھر کی ملامتوں کا ہدف بنا

تو وہ بے خودی میں خدا کا خود کو خطاب دے کے چلا گیا

مرے ہاتھ میں وہ کتاب دے کے چلا گیا

کہ جو ماورائے کلام ہے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 326

منصور سے ان کی وابستگی کے حوالے سے سلطان ناصر کلیات سیّد مبارک شاہ کے دیباچے میں رقم طراز ہیں۔

"سیّد مبارک شاہ جس بے باکی، وارفتگی اور شدت جذبات سے شاعری میں خدا سے مخاطب ہوتے ہیں اس کی مثال حسین بن منصور حلاج، بلھے شاہ اور اقبال کے ہاں ہی تلاش کی جا سکتی ہے۔" 15

"تاہم سیّد مبارک شاہ پر تاریخ کی جس شخصیت کا اثر سب سے زیادہ ہے وہ حسین بن منصور حلاج ہے۔ تصوف، کلام اور شاعری میں شاہ جی نے حلاج سے ایسا اثر

قبول کیا ہے کہ قرآن کے بعد حلاج ہی ان کی شاعری کا اہم ترین ستون بن گیا ہے۔"16

سیّد مبارک شاہ کی نظمیں "زمانے کی تاریخ شاہد رہے گی"(ہم اپنی ذات کے کافر)، "حسین ابن منصور کی ایک نظم (مدارِ نارسائی میں)، اور "نہ جانے اسے کس نے آواز دی تھی" براہ راست حسین بن منصور حلاج کے حوالے سے لکھی گئی نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ کئی نظموں اور اشعار میں سیّد مبارک شاہ حلاج کے لہجے میں گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔

زمانہ سنگ برساتا رہا ہے اس کے چہرے پر
درونِ آئنہ جس نے خدا کی شکل دیکھی ہے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص223

سیّد مبارک شاہ کو حسین بن منصور حلاج میں اپنا آپ نظر آتا تھا۔ وہ حسین بن منصور کے ساتھ اسی گرم جوشی سے مخاطب ہوتا ہے جس سے وہ خدا سے مخاطب ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر وحید احمد کہتے ہیں:

"وہ مجھ سے کئی کئی گھنٹے منصور کے حوالے سے بات کیا کرتا تھا۔ ہماری ڈسکشنز میں منصور کا حوالہ لازمی آتا تھا۔"17

نظم "زمانے کی تاریخ شاہد رہے گی" میں سیّد مبارک شاہ نے دنیا کے سفاکانہ رویے پر طنز کیا ہے۔ اس نظم میں وہ تاریخ عالم میں لوگوں کے نمرود، شداد اور فرعون جیسے بادشاہوں کو خدا ماننے اور حلاج جیسے فنا فی اللہ صوفی کو قابل گرفت قرار دینے پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے کہتے ہیں:

زمانے کی تاریخ شاہد رہے گی
یہ فتویٰ خدا ساز لوگوں نے صادر کیا تھا
"خدا بھی اگر اتنا بے دست و پا
اور غریب الوطن ہو تو بس واجب القتل ہے"
چنانچہ جب اس کے بدن سے

حسین ابن منصور کی کھال کھینچی گئی

اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے اشک ہنستے رہے

اور زمانہ بہت دیر تک اس کو روتا رہا

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص223

نظم "نہ جانے اسے کس نے آواز دی تھی" میں حسین ابن منصور حلاج کی مختصر سوانح ہے۔اس نظم میں سیّد مبارک شاہ نے حلاج کا مقدمہ لڑا ہے۔ نظم میں اس وقت کے معروف صوفی اور عالم دین جنید بغدادی اور حسین بن منصور حلاج کے درمیان اختلاف رائے کو موضوع بنایا ہے۔ اس نظم میں جنید کا کردار وہ نہیں وہ جو اقبال کی نظم "مسجد قرطبہ" میں طمطراق سے نظر آتا ہے۔ سیّد مبارک شاہ کی اس نظم میں جنید ایک ولن کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اس نظم میں سیّد مبارک شاہ نے منصور کی زبانی ابلیس کا مقدمہ بھی لڑا ہے اور ابلیس کے انکار کو مثبت قرار دیا ہے۔

"جنید اس کی حالت سے کب بے خبر تھا

مگر یوں سر راہ دیکھا تو ٹوکا

''حسین ابن منصور! تم جانتے ہو

تصوف طبیبوں کا نسخہ نہیں ہے''

جواباً وہ کیا اس سے کہتا

کہ نسخے طبیب اپنے سینوں میں دفنائے پھرتے ہیں

بازار میں بس دوا بیچتے ہیں

جنید اس کی خاموشیاں سن کے بولا

''تمہیں رازداری کا مطلب پتا ہے!

تم ابلیس کی راہ پر چل پڑے ہو

اور ابلیس کی کوئی منزل نہیں تھی''

''نہیں، یہ عزازیل سے اتنی نفرت!

جنید آپ جیسوں کو شایاں نہیں ہے

اسے منزلوں کی طلب ہی کہاں تھی

رضا اور مشیت کے دو راستے تھے

اسے دونوں جانب سے آواز آئی

تو اس نے مشیّت کا رستہ چنا تھا

پتا ہے!

اسے رازداری کا مطلب پتا تھا''

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص509

اس نظم کے آخر میں منصور کے قتل کے بعد منصور کی جیت کا اعلان ملتا ہے۔

"برِ صغیر پاک و ہند کی تہذیبی روایت میں تصوف، فکر اور فلسفہ کی اہمیت مسلم ہے۔ مبارک شاہ کی شاعری میں بھی متصوفانہ، مفکرانہ اور فلسفیانہ عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان میں بیشتر وحدت الوجود کی فکر کی حامل ہیں۔ جس کے لیے "ہمہ اوست" کی بھی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ یعنی تمام مظاہر میں خواہ کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو اصل ماہیت کے اعتبار سے ان کا وجود ایک ہی ہے۔ مکان ولا مکاں، بے ثباتی و بے اعتباری، مظہر و آثار، بقا و فنا، وجود و انا، وحدت و کثرت اس طرح کے بیان میں شعریت بھی قائم رہتی ہے۔"18

سیّد مبارک شاہ اپنی شاعری میں جا بجا خود کو منصور کے رستے پر چلانے کے لیے اکساتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں خدا تک پہنچنے رستہ زمان و مکان سے آزادی کے ساتھ منسلک ہے۔

اگر رشتۂ جسم و جاں توڑ دوں میں

طلسم زمان و مکاں توڑ دوں میں

خدا کی خدائی کو مسمار کر دوں

جو اک اپنی دیوار جاں توڑ دوں میں

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص56

گوتم بدھ

سیّد مبارک شاہ حسین بن منصور حلاج کے بعد جس شخصیت سے سب سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں وہ گوتم بدھ ہیں۔ بدھا کے نروان میں انھیں عرفان ذات کی منزلیں نظر آتی ہیں۔

ان کی گفتگو میں، نثر و شاعری میں حتیٰ کہ لائبریری میں بھی گوتم بدھ کا کوئی نہ کوئی حوالہ ملتا ہے۔ جام حفیظ لاڑ کہتے ہیں:

> ''جب میں ان کے ساتھ ان کی لائبریری میں گیا۔ تو وہاں علامہ اقبال اور گوتم بدھ کی تصاویر لگی تھیں۔ تو شاہ جی نے ان دونوں تصویروں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ میرے مرشد ہیں۔''19

سیّد مبارک شاہ دنیا کے تمام بڑے انسانوں کا یکساں احترام کرتے ہیں اور ان سے عقیدت و محبت کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ گویا ان کے ہاں تصوف بھی محض اسلامی تصوف تک محدود نہیں رہا بلکہ وہ ہر اس انسان کے پیروکار ہیں جو خدا کی یا اپنی تلاش میں نکلا ہوا ہے۔ وہ اپنے سفر نامے میں خود لکھتے ہیں:

> '' آپ کچھ بھی کہیں، ہم تو گوتم، سقراط، زرتشت اور کنفیوشس کو ماننے والے مسلمان ہیں۔"20

گوتم بدھ سے محبت کی وجہ اپنی ذات کا عرفان حاصل کرنا ہے۔ سیّد مبارک شاہ سمجھتے ہیں کہ عرفان ذات کے بغیر عرفان کائنات ممکن ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ گوتم، سقراط اور تمام عظیم انسانوں کو ایک ہی فہرست میں رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

> "کسی جگہ رسول پاک ﷺ اور گوتم بدھ کا حوالہ دیا کہ دونوں میں ایک بات مشترک تھی کہ یہ اندھیروں سے روشنیاں کشید کر کے لائے تھے۔ اس پر سننے والے خاصے برہم ہوئے کہ یہ شرک ہے۔ نبوت میں شرک کا معاملہ تو ہماری سمجھ سے ماورا ہے۔"21

سیّد مبارک شاہ گوتم کے نروان کو اس سفر کی ابتدا سمجھتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ جب انسان اپنی ذات کی سچائی پا لیتا ہے تو کائناتی سچائی اسے خود بخود اپنی طرف کھینچنے لگتی ہے اگر وہ صرف تمام دکھ ہے کہ گردان کرتا ہوا دنیا سے کنارہ کش رہے تو شاید وہ اس عظیم سچائی کی تمنا بھی نہ کر سکے۔

محمد ارشد کا کہنا ہے۔

"مبارک شاہ نے گوتم بدھ کے اس نروان کا تصور یہاں کرتے ہوئے اس سے گریز کر کے حقیقی خدا کی طرف آنے اور اس کے تصور کو دل میں بسانے کی بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں نروان کی بجائے عرفان حق کی طرف سفر کرنا ہے۔ دکھ حقیقت سہی مگر ہم ان کے لیے اپنے رب سے دور نہیں رہ سکتے اس لیے ہم زندگی کو مکمل دکھ سمجھ کر بے عمل ہونے کی بجائے اس کی کشمکش کو اپنا اور دنیا میں اپنے اعمال کا حصہ ڈالنا ہے"22

انھیں اس بات کا بھی غم ہے کہ دنیا کے بیشتر برے انسانوں کی طرح گوتم کو سمجھنے میں اس کے ماننے والوں نے غلطی کی ہے۔اور اس کا آفاقی پیغام محض رسمی بن کر رہ گیا ہے۔اپنی ایک نظم میں اپنے اسی احساس کی نمائندگی وہ یوں کرتے ہیں:

برگد کی دھوپ میں

مرے مبتلائے فریبِ غم!

تو ہنور اپنے مراقبے سے اٹھا نہیں

تجھے کیا خبر

ترے معتقد، ترے منحرف

تجھے جنگلوں سے نکال، سنگ میں ڈھال

پھر سے چمکتے شیشوں کی ششدری میں سجا گئے''

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص512

زاہد و ناصح

اردو ادب کے مختلف ادوار میں ملا، مولوی، زاہد اور واعظ ادیبوں اور شاعروں کے مشق ستم کا نشانہ بنتے رہے ہیں۔ آج کے دور میں ایسے کسی ادب پر اعتراض کیے جانے پر عموماً اردو ادب کی روایات کا حوالہ دیا جاتا ہے۔کسی دور میں مذہبی حلقوں سے علامہ اقبال کی بھی مخالفت کی گئی تھی لیکن آج مجموعی طور پر اقبال احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ علامہ اقبال کی شاعری میں استعمال

شدہ ملّا اور مجاہد کی اصطلاح معروف ہے۔ اقبال کی شاعری میں ملّا پر سخت تنقید ملتی ہے۔ لیکن جہاں پر بھی علامہ نے ملّا پر طنز یا تنقید کی ہے اس کے سیاق و سباق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ کس وجہ سے ملّا پر نالاں ہیں۔ ایک جگہ پر علامہ اقبال ملّا کو مجاہد کے ضد کے طور پر بھی پیش کرتے ہیں۔ ملّا کے سلسلے میں علامہ کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
کلیات اقبال

مزید ملاحظہ ہو:

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد
کلیات اقبال

ایک نظم ملّائے حرم میں یہ فرماتے ہیں:

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے، نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام
ہماری سعی پیہم کی کرامت ہے کہ آج
کلیات اقبال

ان اشعار سے ملّا کی اندھی مخالفت کے بجائے اس بات کی وضاحت ملتی ہے کہ علامہ اقبال کیوں ملّا سے ناراض ہیں۔ دین میں جمود، اپنے اور آدمیت کے مقام کا ادراک نہ کرنا، اجتماعی زندگی سے دین کو الگ رکھ کر صرف عبادات تک محدود رکھنا، ملوکیت کے آگے جھکنا، دین پر عمل کرنے کے بجائے صرف زبانی نصیحتوں پر اکتفا کرنا وغیرہ۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے بجا لکھا ہے کہ:

"شاعر اور خاص طور پر غزل گو شاعر کا مزاج اور افتاد طبع ادعا پسندی کی کبھی
حریف نہیں ہو سکتی۔ ادعا پسندی کا علمبردار زندگی کے پے چیدہ حقائق کو من مانے

طور پر سادہ تصور کر کے صرف اپنے نقطہ نظر سے انھیں سمجھنا چاہتا ہے۔ وہ کسی دوسرے کے نقطہ نظر کو دیکھنا پسند نہیں کرتا اور نہ سمجھنا چاہتا ہے۔ وہ سب کچھ کرتا ہے سوائے احتساب نفس کے۔ کٹر پن اور ادعا پسندی کے جلو میں تعصب اور تنگ نظری کا قافلہ بھی ہے جو ہر اس تصور کو اپنے پاؤں تلے روندتا جاتا ہے جس میں رواداری اور انسانی محبت کی بات ہو۔ یہ ادعا پسندی ایک زمانے میں مذہبی رنگ لیے ہوئے تھی، اسی لیے ہمارے شاعروں نے زہد پر چوٹیں کیں اور اس کی چوریاں ایک ایک کر کے دکھائیں اور تجریدی اور مذہبی اصول سے زیادہ محبت اور انسانیت کو اہمیت دی۔"23

اردو شاعری کی تاریخ میں اگر کسی ایک کردار کو سب سے زیادہ مردود و مطعون قرار دیا گیا ہے تو وہ مُلّا ہے۔ کبھی زاہد تو کبھی شیخ، کبھی ناصح تو کبھی واعظ کے نام پر اس پر خوب دل کھول کر تنقید کی گئی ہے۔ دراصل میں شاعری میں یہ کردار ایک ایسے انسان کی نمائندگی کرتا ہے جو ریاکار ہے، منافق اور اصل معنوں میں دنیا دار ہے۔ یہ کردار لوگوں کو مذہب کے نام پر ڈراتا دھمکاتا اور بلیک میل کرتا ہے۔ معاشرے میں نفرت، شدت پسندی اور تفریق کو ہوا دیتا ہے۔ دراصل یہ وہ کالی بھیڑیں ہیں جو کسی بھی شعبہ ہائے زندگی کو قابل نفرت بنانے کا بیڑہ اٹھائے رکھتی ہیں۔ اس کردار کا تعلق کسی خاص مذہب، علاقے یا ملک سے نہیں ہے بل کہ ایسے اانسان ہر مذہب اور علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی دنیا اور لوگوں کی آخرت سنوارنے کی بھاری ذمہ داری خود بخود اٹھا لیتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں:

''اردو شاعری میں مذہبی تنگ نظری و سخت گیری، ملّائیت و مولویّت کے حوالے سے بطورِ احتجاج مُلّا، واعظ، ناصح اور اِن کے بعض متعلقات کا مذاق اُڑانے اور ان پر طنز کرنے کا رواج بہت پُرانا ہے اور فارسی سے اردو کو وِرثے میں ملا۔ چنانچہ اردو کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس کے یہاں واعظ و ناصح اور ان کے قبیل کے دوسرے افراد کو طنز و مزاح کا نشانہ نہ بنایا گیا ہو۔''24

اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ ہر مذہبی انسان ہی اس طرح کی شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ مغربی دنیا جسے مذہب بیزار سمجھا جاتا ہے اس نے نیوٹن اور آئن سٹائن جیسے انسانوں کو جنم دیا جو کہ مذہبی ہونے کے باوجود اعلیٰ انسانی اوصاف کے حامل تھے۔ سیّد مبارک شاہ کے یہاں بھی اردو

شاعری کی اسی روایت کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ خاص طور پر طالبان کی حکومت اور القاعدہ اور داعش جیسی تنظیموں کی طرف سے مذہب کو بنیاد بنا کر جس نظریے کو پروان چڑھایا جاتا رہا ہے اس کے لیے اردو شاعری کی اس روایت کی تجدید ضروری ہو گئی ہے۔

سب سے پہلے تو ریاکار مذہبی انسان کی منافقت کا پردہ چاک کرنا ضروری ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کو نصیحت، خود میاں فصیحت کے محاورے پر عمل کرتا ہے۔ مذہب اس کی روح کو چھو کر بھی نہیں گزرتا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ایسے انسانوں کا تعلق کسی ایک مذہب یا خطے سے نہیں ہوتا۔ جب سیّد مبارک شاہ منیلا اور تھائی لینڈ کے سفر پر نکلے تو گوتم کے ماننے والوں کو دیکھ کر بہت دکھی ہوئے۔ وہ کہتے ہیں:

> "انسانی جسم کی حرمت کی اس سے بڑی کوئی دلیل تا دم تحریر ہمیں میسر نہیں ہے مگر بدھوں نے بدن کو پاک کرنے کے لیے اسے نور کی آنچ سے کندن بنانے کے بجائے آگ میں تپا کر فروخت کرنا شروع کر دیا۔ گوتم پرستوں نے انسانی جسم کی حرمت کو جس قدر پامال کیا اسے دیکھ کر روح لرز جاتی ہے۔"25

اس بیان سے ہمیں پھر اقبال کا ایک شعر یاد آتا ہے۔

یہی فقیہہ حرم ہے جو بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بو ذر و دلقِ اویس و چادر زہراء

کلیات اقبال

موجودہ دور کے ایک شاعر شناور اسحاق لکھتے ہیں:

مرے سجدوں میں اب اعداد ہیں اسماء نہیں ہیں
مرا داغِ جبیں دینا جیسا ہوگیا ہے

ادھورا نروان

اس احساس کو سیّد مبارک شاہ یوں بیان کرتے ہیں۔

دلوں کا میل بھی کم تو نہیں تھا
مگر داغِ جبیں دیکھا گیا ہے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص432

سیّد مبارک شاہ کے مطابق ایسے لوگ آپ کو کبھی کسی بھی مذہب کی روح تک نہیں پہنچنے دیں گے۔ایسے لوگ آپ کو اسلام، عیسائیت، یہودیت اور بدھ ازم کا پیروکار تو بنا سکتے ہیں لیکن ان کی اصل روح تک رسائی حاصل کرنے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے کیوں کہ ان کے یہاں مذہب ایک قابل فروخت شے ہے جسے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کسی بھی وقت استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ہمیں نابود مت کرنا

کسی نے میرے ماتھے پر تلک داغا
صلیبوں کو مری چھاتی پہ کھینچا
اور کانوں میں اذاں بھر دی
اور پھر اس کے بعد
پیشانی پہ انگارے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص370

خدا سے محبت پیدا کرنے کے بجائے یہ لوگ جنت کی خواہش پیدا کرنے پر تلے ہیں۔جیسے کوئی سیل ایجنٹ کسی بھی کاروبار کی پروموشن کرتا ہے۔انسان میں خدا نے دو بنیادی صفات رکھیں۔ایک ارزل صفت ہے تو دوسری افضل۔ایک صفت لالچ ہے تو دوسری خوف۔مولوی ان دونوں کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔لالچ اور طمع کے ہاتھوں مجبور لوگ جنت کے حصول کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہوتے ہیں۔اسی طرح خوف سے یہ لوگوں کے دلوں میں جہنم کا ڈر بٹھاتے ہیں۔

یہ کیسی ہوس ناک قناعت ہے خدایا!
جو تارکِ دنیا ہے وہ فردوس طلب ہے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص429

فسادِ فی سبیل اللہ دیکھا تو یہ سوچا ہے
جو سوچا تھا فرشتوں نے خدا اب سوچتا ہوگا
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 335

بس حدیثِ دوزخ اب ناتمام رہنے دے
کچھ خدا کا سینوں میں احترام رہنے دے
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 192

جنت کی ہوس جن کی اطاعت کا سبب ہے
ان کے لیے کم پڑتی ہے دوزخ کی سزا بھی
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 192

اپنی اذاں تو کوئی موذن نہ سن سکا
کانوں پہ ہاتھ رکھے ہوئے بولتا رہا
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 78

جب معاشرے میں یہ منافقت پروان چڑھتی ہے تو تمام تر عبادات کرنے اور عقائد رکھنے کے باوجود انسان معیار انسانیت سے گر جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ایک ایسے معاشرے کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کا ظاہر اور باطن سراسر ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ لوگ اختلافات کو مخالفت کا پہناوا پہنانے کے بعد نفرت کی فضا قائم کرتے ہیں۔ مغرب کا تاریک دور ہمارے سامنے ہے جب چرچ کی حکمرانی تھی اور مذہب کو ہر جائز ناجائز کام کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ سیّد مبارک شاہ کہتے ہیں کہ جب انسان خود خدا بن جائیں تو خدا ایسی بستی سے دوری اختیار کر لیتا ہے۔

ہو خداؤں کا تسلط جس جگہ
اس علاقے میں خدا ہوتا نہیں
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 317

عین ممکن ہے کہ معیار بشر سے گر کر
اپنی دانست میں انسان خدا ہو جائے
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 251

آزاد کر خدا کو خداؤں کی قید سے
سارے بتانِ مسلکِ نفرت تباہ کر

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص154

اک حبس ہے زندانِ مذاہب میں بلا کا
گھٹ جائے گا دَم ایسے مکانوں میں خدا کا

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص149

خدا کا تصور ان ریاکار علماء اور صوفیاء نے ایسے بادشاہ کا سا رکھا ہے جو اپنی رعایا کے ساتھ سختی سے پیش آتا ہے۔ یہ تصور کسی حد تک دور بادشاہت اور پھر نوآبادیات کی دین ہے۔ جب حکمران کے لیے کوئی اصول و ضوابط اور قانون نہیں۔ بادشاہ خود صاحب عدل ہے وہ جو چاہے کرے اس لیے ضروری ہے کہ ڈر اور خوف کی فضا ہمیشہ رعایا کے سروں پر مسلط رہے۔ اس لیے سیّد مبارک شاہ کہتے ہیں کہ ہمیں خدا کا یہ کلیشے توڑنا ہو گا کیوں کہ اس سے خدا سے قربت کی جگہ دوری بڑھ رہی ہے۔

خدا کو آدمی سمجھا ہے تُو نے
جو ایسے گڑگڑا کے مانگتا ہے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص527

جھٹک دیتا ہوں ہاتھوں کو اٹھا کر
مجھے وہ مجھ سے بہتر جانتا ہے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص528

سیّد مبارک شاہ اپنی شاعری میں اس ریاکاری کا پردہ جا بجا چاک کرتے ہیں۔ اور خدا کو ماننے والوں کو اسے صدق دل سے ماننے اور اس جاننے پر زور دیتے ہیں۔ وہ مذہب کو محض رسمی عبادات اور چند عقائد کا مجموعہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے طرز حیات کے طور پر اپنانا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ بار بار کہتے ہیں کہ اگر آپ خدا کے رستے پر چل نکلے ہیں تو خدا کے اصولوں پر چلنا ضروری ہے ورنہ اس دوہری شخصیت کی نہ تو مذہب میں کوئی گنجائش ہے نہ اس کے لیے دل میں عزت ہے۔

"ادعائیت، ملائیت، مذہبی تشدد و سخت گیری، ظاہر پرستی، تفرقہ اندازی اور ابن الوقتی کے خلاف بغاوت بن کر روشن خیالی، رواداری، انسان دوستی اور عوام سے قربت کا مسلک بن جاتا ہے۔"26

بتا اُن اہل ایماں کی سزا رکھی ہے کیا تُو نے
خداوندا! جو تجھ کو احتیاطاً مان لیتے ہیں
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص409

دس روز تک رواہے تجھے ماتم حسین
پھر سال بھر اطاعتِ شمر و یزید کر
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص213

یہ حسین کو خبر ہے کہ جو اس زماں میں ہوتے
تو یہ سوگوار سارے صف دشمناں میں ہوتے

جبر و قدر

جبر و قدر کا مسئلہ ہمیشہ سے ہی الٰہیات میں زیر بحث رہا ہے۔ کیا تمام خیر و شر اللہ کے حکم کے پابند ہیں؟ کیا انسان کے پاس اختیار بھی اللہ کا دیا ہوا ہے؟ کیا انسان اللہ کی مرضی کے خلاف کچھ کر سکتا ہے؟ اگر نہیں تو انسان سعی ہی کیوں کرے اور اس پر اس کا محاسبہ ہی کیوں کیا جائے؟ یہ سوالات اور ان کے ممکنہ جوابات ہمیشہ سے ہی شعراء کا محبوب موضوع رہا ہے۔ خاص طور اردو کلاسیکی شاعری میں یہ موضوع آپ کو تقریباً" تمام شعراء کے یہاں نظر آئے گا۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہیں جو سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
(میر تقی میر)

سیّد مبارک شاہ جب خدا کی تلاش میں نکلتے ہیں تو خود کو بے بس پاتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں اکثر زمان و مکاں کی قید کا ذکر کرتے ہیں۔ حدود و قیود میں پھنسا ہوا انسان مالک حقیقی تک کیسے پہنچ پائے وہ تو جبر و قدر کی گھاٹیوں میں مقید ہے۔

اگر رشتۂ جسم و جاں توڑ دوں میں
طلسم زمان و مکاں توڑ دوں میں
خدا کی خدائی کو مسمار کر دوں
جو اک اپنی دیوار جاں توڑ دوں میں

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص56

لیکن یہ تمام کام ناممکن ہیں کیوں کہ انسان خود پر اتنا اختیار نہیں رکھتا۔ سیّد مبارک شاہ کے مندرجہ ذیل شعر میں موجود کرب قاری محسوس کر سکتا ہے جب ایک انسان تمام تر کوشش کے باوجود کچھ نہ حاصل کر پائے۔

لیس للانسان الا ماسعٰی
تو مگر پھر بھی نہ مجھ کو مل سکا

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص56

پھر جب شاعر دنیا میں موجود ظلم و جور کا میدان گرم دیکھتا ہے تو وہ کڑھتا ہے کہ وہ کسی شکنجے میں جکڑا ہوا ہے جہاں چاہ کر بھی وہ اپنے حالات کو سدھار نہیں سکتا۔ ایک خدائی نظام ہے جو کائنات کے کل پرزے چلا رہا ہے۔ اس پر شاعر کہتا ہے کہ اگر خدا نے تمام تر اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں تو دنیا اس قدر بگاڑ کا شکار کیوں ہے۔

پھر شاعر مذاہب کی بات کرتا ہے کہ ہر انسان فطرت سلیم پر پیدا ہوتا ہے مگر اس کا ماحول اور لوگ اسے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور یہودی بناتے ہیں۔ لیکن ہر مذہب میں دیگر مذاہب کے ماننے والے معتوب ٹھہرتے ہیں۔ گویا یہاں بھی کسی مذہب کو ماننے والا ذمہ دار نہیں بلکہ اس کی تمام تر ذمہ داری بنانے والے پر عائد ہوتی ہے۔

ہمیں نابود مت کرنا

کسی نے میرے ماتھے پر تلک داغا
صلیبوں کو مری چھاتی پہ کھینچا
اور کانوں میں اذاں بھر دی

اور پھر اس کے بعد

پیشانی پہ انگارے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص370

سیّد مبارک شاہ کی تیسری کتاب "مدار نارسائی" کا عنوان بھی جبر و قدر کی قید کا غماز ہے۔ شاعر کو اپنی نارسائی بارہا محسوس ہوتی ہے وہ چاہتے ہوئے بھی اس کی قید سے خود کو رہا نہیں کر پاتا۔

لپٹ کر کیوں نہ مرجائیں جو مرنا ہے جدائی میں
یہ کم ہے اختیار اپنا مدارِ نارسائی میں

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص517

خدا اور تنہائی

سیّد مبارک شاہ کی شاعری خدا کے تذکرے کے بغیر ادھوری ہے۔ سیّد مبارک شاہ جب کسی زمینی یا بشری مسئلے سے نبرد آزما ہوتے ہیں تو وہاں بھی کسی نہ کسی حوالے سے خدا کا تذکرہ لازمی آتا ہے۔ سیّد مبارک شاہ جب دنیا کی کشمکش سے اکتا جاتے ہیں تو اس کا گلہ خدا سے کرتے ہیں۔ جب فلسفے کی گتھیاں نہیں سلجھا پاتے تو خدا سے استفسار کرتے ہیں۔ جب بے یقینی اور لاچارگی کی فضا میں ہوتے ہیں تو خدا سے گلہ کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جب اکیسویں صدی کے انسان کی طرح خود کو اکیلا اور تنہا محسوس کرتے ہیں تو وہ خدا کے اس کرب سے واقف ہوتے ہیں جو اکیلا ہے اور رہے گا۔

اکیلا تو خدا پہلے سے تھا ہی
مگر اب تو وہ تنہا رہ گیا ہے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص458

انسان کا اکیلا پن سماج کا عطا کردہ ہے لیکن خدا کا اکیلا پن اس کا ذاتی فیصلہ ہے۔ وہ اپنی رضا سے اس عظیم تنہائی کا شکار ہے۔ لیکن سیّد مبارک شاہ کو انسان میں خدا کا عکس نظر آتا ہے جیسے ہر مخلوق خالق کا پرتو ہوتی ہے۔ انسان معاشرتی حیوان ہے اور تنہائی اس کی فطرت کے خلاف ہے اس لیے شاعر کو کبھی کبھی خدا کے یہاں بھی یہی خواہش نظر آتی ہے۔

جھانکتی رہتی ہیں اس کی کھڑکیاں
جس مکاں کا در کھلا کاروئی نہیں

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص108

یہی وجہ ہے قاری کو سیّد مبارک شاہ کی شاعری میں کبھی خدا انسان کے بھیس میں زمین پر چلتا پھرتا نظر آتا ہے تو کبھی انسان سے بات چیت کرتا، ہنستا مسکراتا، سوال و جواب کرتا اور زندہ بلکہ سانس لیتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ آسمانوں کا اکیلا پن نہیں سہار سکتا تو اپنی مخلوق کے درمیان آ بستا ہے۔

ڈھونڈتا پھرتا ہے دھرتی پر کہیں
آسمانوں کا خدا اپنی جگہ

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص115

سیّد مبارک شاہ اس کائنات کی تخلیق کی وجہ بھی اسی عظیم تنہائی کو قرار دیتے ہیں۔ جب خدا کو اس تنہائی سے نجات چاہیے تھی تو اس نے 'کُن' کہا اور کائنات تخلیق کی۔

ایک ناگفتہ مکالمہ

کبھی تم نے یہ اپنے دل سے پوچھا ہے
کہ آخر اس تردد کا سبب کیا تھا
ہماری بے ثباتی کے علاوہ تو
تم اپنی جاودانی ناپنے کا کوئی پیمانہ نہ رکھتے تھے
ترستے تھے تم اپنی شکل تکنے کو
کہ کوئی آئنہ خانہ نہ رکھتے تھے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص199

سیّد مبارک شاہ صرف اسی نکتے پر ہی اپنی بات ختم نہیں کرتے کہ خدا کو تنہائی سے اکتا کر کائنات بنانے کی سوجھی بلکہ وہ ماضی میں جانے کے بجائے مستقبل میں زقند بھرتے ہیں اور اپنی متخیلہ سے یہ جاننے کہ کوشش کرتے ہیں کہ تب خدا کا کیا فیصلہ ہو گا۔ وہ تصوف کے رستے پر چلنے

والوں کے سامنے ایک نیا مسئلہ لا کھڑا کرتے ہیں کہ صرف خدا کا ماضی ہی سمجھنے کی ضرورت نہیں ، صرف ازل کی کارگزاریاں جاننا ہی اس رستے کا کھیل نہیں بلکہ ابد اور اس کے بعد کیا ہونے والا ہے اس کے بارے میں بھی غور و فکر کی دعوت ہے۔

تصوف زدگاں کے واسطے

ڈھلنے والا ہے یہ ابد کا دن
دیکھیے کل خدا کو کیا سوجھے
پھر سے تمثیلِ زندگی دیکھے
یا کوئی مشغلہ نیا سوجھے
پھر سے اپنا ثبات لے بیٹھے یا کچھ اس سے بھی ماورا سوجھے
اور تنہائیوں سے اکتا کر
کچھ نہ سوجھے تو جانے کیا سوجھے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 601

گمان و یقیں

عقیدے اور عقیدت کا سب سے ضروری جزو یقین ہوتا ہے۔ جب انسان کسی کو اپنا خالق و مالک مان لیتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ یقین کی آخری حد تک اس پر بھروسہ کرے اور اس کے کہے کو حرف آخر سمجھے۔ انسان کا بنیادی امتحان یہ ہے کہ اسے غور و فکر کرنے کی صلاحیت بخشی گئی ہے لیکن اس پر اسے یقین بھی رکھنا ہے۔ سیّد مبارک شاہ کا ماننا ہے کہ قوت ایمان سے انسان ان ہونی کو ہونی کر سکتا ہے۔ یہ واحد طریقہ ہے جو آپ کو ناممکنات کے رستوں پر بھی ممکنات کی منزلیں عطا کر دیتا ہے۔

یہ شرط ہے دستک ہو اگر دست یقیں سے
در چھوڑ کے دیوار بھی کھل جائے کہیں سے

لگتا ہے کہ سچ مچ کہیں موجود ہے دنیا
ہم وہم بھی کرتے ہیں تو کرتے ہیں یقیں سے

کلیات سیّد مبارک شاہ، 44

شاعر کو اس بات کا احساس ہے کہ یہ راستہ اس قدر آسان نہیں ہے۔ کئی گمان کے جنگل اس کے راستے پر آتے ہیں۔ سیّد مبارک شاہ کو اس بات کا کس قدر فہم ہے اس کا اندازہ اس بات سے کریں کہ ان کی پہلی کتاب کا نام بھی "جنگل گمان کے" ہے۔ یہ راستہ اس قدر دشوار ہے کہ اس پر قدم رکھنا بہت آسان ہے مگر اس پر چلتے رہنا اتنا ہی مشکل ہے۔ بقول اختر عثمان:

راہ سفال گری چلتے کب یونہی حرم آ جاتا ہے
کمریں کوزہ ہو جاتی ہیں روح میں خم آ جاتا ہے

سیّد مبارک شاہ کہتے ہیں:

منزل ترے یقین کی اس پار ہے مگر
کتنے گھنے ہیں راہ میں جنگل گمان کے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 49

سیّد مبارک شاہ کہتے ہیں کہ جب سالک ایک بار سلوک کے رستے پر نکل پڑے تو اس کے دل میں مشکلات سہنے کا حوصلہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ بیلجیئم کی کہاوت ہے کہ جب خدا انسان کی قسمت میں پتھریلے رستے لکھتا ہے تو اسے لوہے کے جوتے بھی دیتا ہے۔ سیّد مبارک شاہ سب سے پہلے عرفان ذات کا درس دیتے ہیں۔ یقین کے رستوں پر آپ تبھی چل سکتے ہیں جب سب سے پہلے آپ خود پر یقین لائیں۔ جب آپ نے اپنی ذات سر کر لی تو خدا کی قربت آپ سے چنداں دور نہیں۔ سو خدا پر یقین اور ایمان کا سفر سب سے پہلے اپنی ذات سے شروع ہوتا ہے۔ آپ اپنی ذات کے گمان تج دینے میں کامیاب ٹھہرے تو یقین کی اعلیٰ منازل آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔

اس گھڑی ایمان لایا خود پہ میں
جب زمانہ ہو گیا منکر مرا

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 60

سر جھک گیا ہے اپنی ہی رفعت کے سامنے
میں تجھ کو پوجتا ہوں خدائے بشر پرست

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص80

خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

نطشے سے لے کر جدید دور کے مذہب بیزار انسان تک خدا سے تفاوت اور انکار کی روایت چلی آرہی ہے۔ خاص طور پر جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم دوم کے بعد کا طرز فکر خاصا تبدیل ہو گیا ہے۔ انسان عقیدے کے نام سے بدکتا ہے۔ جدید سائنسی شعور نے انسان کی فکری و عقلی تربیت تو ضرور کی لیکن روحانی طور پر کمزور بنا دیا۔

سیّد مبارک شاہ کے یہاں جہاں خدا سے از حد قربت کا تعلق شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے وہیں وہ خدا سے شکوہ کناں بھی نظر آتا ہے۔

الم ترکیف

جس گھڑی
میرے شہروں کی بستی ہوئی بستیاں
قتل کر دی گئیں
خوں سے بھر دی گئیں
کیا وہ لمحہ بھی تیری ہی تخلیق تھا

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص118

دنیا کی لوٹ مار نے دنیا اجاڑ دی
پل بھر کو آنکھ کیا لگی پروردگار کی

کلیات سیّد مبارک شاہ ص228

دھرتی اور اس کے باشندوں سے لاتعلقی خدا اور انسان کے درمیان دور کا باعث ہے۔ نطشے نے تبھی کہا تھا کہ انسانوں کے مابین یہ نفرت اور ظلم کی فضا سے ثابت ہوتا ہے کہ اول تو خدا ہے

نہیں اگر تھا بھی تو شاید اب نہیں رہا۔ اس بے پناہ تباہی اور بربریت پر ''خدا کی موت'' دال ہے۔ سیّد مبارک شاہ خدا سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اگر خدا کی طرف سے اسی طرح انسان کو اکیلا چھوڑا گیا تو وہ دن دور نہیں جب انسان مکمل طور پر مایوس ہو جائے اور خدا سے ناطہ توڑ لے۔

وقت آجائے گا ایسا بھی تری دہلیز پر
بند ہو جائے گی دستک، در کھلے رہ جائیں گے
کون دیکھے گا تری جانب خدائے دربدر
لوگ تیرے در کا پتھر چومتے رہ جائیں گے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص133

سیّد مبارک شاہ کی شاعری میں ہمیں خدا سے مخاصمت نہیں نظر آتی بس خوگر حمد کی زبان سے ہونے والا شکوہ محسوس ہوتا ہے۔ وہ خدا سے کبھی کبھار ذرا سخت لہجے میں بھی بات کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن وہ اسے پوئٹک لائسنس کہتے ہیں کہ شاعر کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔ مثلاً وہ اپنی ایک نظم میں خدا سے اس کے ثبات و دوام کے لیے انسان کی ضرورت کے موضوع پر بات کرتے ہیں کہ جتنا انسان کے لیے خدا ضروری ہے اتنا ہی خدا کے لیے انسان۔

ایک ناگفتہ مکالمہ

کبھی تم نے یہ اپنے دل سے پوچھا ہے
کہ آخر اس تردد کا سبب کیا تھا
ہماری بے ثباتی کے علاوہ تو
تم اپنی جاودانی ناپنے کا کوئی پیمانہ نہ رکھتے تھے
ترستے تھے تم اپنی شکل تکنے کو
کہ کوئی آئنہ خانہ نہ رکھتے تھے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص199

شکوہ و شکایت اور خدا سے سوالات کا سلسلہ طویل ہے۔ گویا یہ محبت میر کی محبوب سے محبت نہیں ہے بلکہ غالب کی محبت ہے۔ اگر وہ محبوب کا جاہ و جلال اور طنطنہ ختم نہیں ہونے دیتا تو اپنی انا

اور عزت نفس کو بھی کسی طور کم نہیں کرتا۔ وہ صرف خدا کی حمد و ثناء ہی بیان نہیں کرتا بلکہ کچھ کڑوے کسیلے سوالات بھی پوچھتا جاتا ہے۔

کس نے رکھا ہمیں خسارے میں
کس نے کھائی قسم زمانے کی
میری شہ رگ پہ بیٹھنے والے!
بات کرتا ہے آزمانے کی؟

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص209

دیوارِ لامکان کے سائے میں جا چھپا
ہم پر فرازِ عرش سے تارے اچھال کر

کلیات سیّد مبارک شاہ ص216

زمیں پر وسوسے جاگے ہوئے ہیں
کہ تُو افلاک پر سویا ہوا ہے

کلیات سیّد مبارک شاہ ص297

وہ خدا سے کہتا ہے اسے اب اپنی پالیسی میں تبدیلی کرنا ہوگی۔ نیا انسان خدا سے زیادہ دور ی سے بیزار ہوگیا ہے۔ آج کا انسان دنیا اور کائنات کے فاصلے مٹانے پہ تلا ہے۔ وہ شہ رگ سے قریب خدا کو یوں مشورہ دیتے ہیں۔

شہ رگ کو چھوڑ کر مرے سینے سے لگ کبھی
دل میں قیام ساکنِ حبل الورید کر

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص213

سیّد مبارک شاہ خدا کو حجابات اٹھانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اب خدائے بے نیاز کو اپنے اصولوں میں ترمیم کرنا ہوگی۔ خدا سے وہ سوالات اس طرح پوچھتے ہیں جیسے ہمیں اقبال کے یہاں خدا سے محبت کا تعلق نظر آتا ہے۔ وہ خدا کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

گریز پا ہو ا اگر تو کیوں میرے قریب ہے
تردِ خدائے بے نیاز بھی عجیب ہے

میں داستانِ خام ہوں تو کوئی فیصلہ کرے
کہ میں ہوں ذمہ دار اس کا یا مرا ادیب ہے
ہزار بے حجابیاں عیاں ترے حجاب سے
ہٹا بھی اپنے رخ سے یہ نقاب جو نقیب ہے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 260

نیا انسان خدا سے مایوس ہوتا جا رہا ہے لیکن سیّد مبارک شاہ اچھے مستقبل کے لیے اس لائف لائن کو بچا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ خدا سے اپنے مسائل پر بات کرتے ہیں۔ خدا سے انسان کی حدود و قیود و جمود کو ختم کرنے کی دعا کرتے ہیں۔ ان کے یہاں مایوسی نظر نہیں آتی۔

ایک ناگفتہ دعا

اجاڑ ہے جہانِ رنگ و بو جہاں
نہ بوئے رنگ آرزو، نہ رنگِ بُوئے جستجو
یہ قیدِ بے کنار بھی مرے جنوں پہ تنگ ہے
نہ زندگی کی آرزو، نہ موت کی امنگ ہے
نہیں ہے اس جمود کو مطابقت، تری مری سرشت سے
مرے خدا! نجات دے تو کون دے
ہمیں عذابِ دوزخ و بہشت سے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 217

سیّد مبارک شاہ جب دنیا میں ظلم و دہشت کی ہولناکیاں دیکھتے ہیں تو ان کے اندر کا حساس انسان صرف انھیں ہی بے چین نہیں کرتا بلکہ ان کے یہاں خدا کا تصور بھی بے قرار وجود کے طور پر ملتا ہے۔ یہاں صرف ان کا دل نہیں دکھتا بلکہ وہ خدا کا تصور بھی ایسی ہستی کے طور پر کرتے ہیں جو انسانوں کی اس بستی سے نالاں ہے اور خاص طور پر انسان کے دوغلے پن اور منافقت سے بیزار ہے۔

افتاد

یہ معصوم بچوں کے سفاک چہرے
کہ جیسے فرشتوں کے ناپاک چہرے
تڑختی بہشتیں ، جہنم کدوں میں
ہوس کی اطاعت سبھی معبدوں میں
یہ دھبے سے سورج کی اجلی ضیا پر
تعفن کے چھینٹے قبائے صبا پر
برستا ہے کیوں نور کذب و رِیا پر
یہ پھٹکار کیسی ہے صدق و صفا پر
تذبذب زدہ آپ اپنی ثنا پر
عجب وقت آیا ہے میرے خدا پر

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص287

اب کس سے کہوں مجھ کو کیوں نیند نہیں آتی
روتا ہوا دیکھا ہے خوابوں میں خدا میں نے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص277

سیّد مبارک شاہ کے یہاں خدا کی انسان سے لاتعلقی دراصل انسان کی خدا سے دوری کے باعث ہے۔ گزرے زمانوں میں جب انسان کفر و الحاد میں مبتلا ہوتا تھا اور وہ خدا کے ناپسندیدہ رستے پر چلنے لگتا تھا تو اس کی رہنمائی اور اصلاح کے لیے پیغمبر بھیجے جاتے اور آسمانوں سے صحیفے نازل کیے جاتے اگر اس پر بھی وہ انسان مطمئن نہ ہوتا تو اسے معجزات سے قائل کیا جاتا تھا۔ یعنی آخری حربے کے طور پر کوئی معجزہ ہی انسان کو راہ راست پر لاتا تھا۔ لیکن موجودہ دور کے انسان سے خدا اس قدر نالاں اور افسردہ دکھائی دیتا ہے کہ اسے اب اانسان کے سدھرنے کی کوئی امید نہیں ہے۔

معجزہ

وہ دور کیا تھا کہ جب خدا اپنے منکروں کو
خود اپنے ہونے کی آپ آکر دلیل دیتا

وہ بدگمانوں پہ مہرباں تھا
کہ ان کے دل میں خود اپنی صورت اتار دیتا
دلوں میں رہتے ہوئے تشکک
کو معجزوں سے قرار دیتا
یہ دور کیا ہے، خدا بھی جس میں ترس گیا ہے
کوئی تو ایسا بھی معجزہ ہو جو اس کو
انساں کی زندگی کا یقیں دلائے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 267

اتریں گے پیمبر، نہ فرشتے ،نہ صحیفے
کس بات پہ روٹھا ہے خدا اہل زمیں سے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 44

لیکن ان تمام سوالات کا جواب وہ خود ایک جگہ یوں دیتے ہیں۔

کیا نارسائی شرط ہے خواہش کے واسطے
تجھ سے گریز پا ہے ترا قُرب جُو ابھی

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 251

اقبال کے تصور خودی کے بعد سیّد مبارک شاہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے تواتر کے ساتھ عرفان ذات کے موضوع پر شاعری کی ہے۔ سیّد مبارک شاہ کے یہاں خدا اور انسان کے درمیان فاصلے کم کرنے کی کوشش نظر آتی ہیں ۔وہ انسان کو خدا کے قریب کرنے کی سعی میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ تشکیک کو راہ کا پتھر نہیں سمجھتے بلکہ اس کے ہوتے خدا تک پہنچنے کا حل بھی ہمیں بتاتے ہیں۔

جس کے ہاتھوں میں نہیں تشکیک کا کنکر کوئی
اس کو اندازہ کہاں ہے سطح کی گہرائی کا

کلیات سیّد مبارک شاہ ، صفحہ 46

منزل ترے یقین کی اس پار ہے مگر
کتنے گھنے ہیں راہ میں جنگل گمان کے

کلیات سیّد مبارک شاہ ، صفحہ 49

سیّد مبارک شاہ خدا کے وجود کے منکرین سے دست و گریبان نہیں ہوتے بلکہ وہ اس بھی ایمان کی طرف بڑھتا ہوا قدم ہی گردانتے ہیں۔ ارشد محمود لکھتے ہیں:

"یہ انسان ہی ہے جو شعور کی ایک سطح پر خدا کا اقرار کرتا ہے اور شعور کی دوسری سطح پر اس کے وجود سے انکار کرتا ہے۔"26

سیّد مبارک شاہ کے یہاں خدا ایک عظیم ہستی کے ساتھ ساتھ انسان کا قریبی دوست بھی نظر آتا ہے۔ وہ انسان اور خدا کا تعلق لازمی قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق انسان کے لیے خدا سے تعلق ناگزیر ہے کیوں کہ خدا انسان کا سب سے قدیم دوست ہے۔ سیّد مبارک شاہ خدا اور انسان کے درمیان صرف خالق اور مخلوق کے تعلق تک محدود نہیں رہتے۔ دونوں کا تعلق لازم و ملزوم قرار دیتے ہیں۔

وہ مرے سوا ہے لیکن
کوئی دوسرا نہیں ہے

کلیات سیّد مبارک شاہ ، ص 109

جیسے کہ حبس ہو تو ہوا ناگزیر ہے
اس دورِ بے اماں میں خدا ناگزیر ہے

کلیات سیّد مبارک شاہ ، صفحہ 112

شرک و الحاد

شریعت اسلامی میں سب سے بڑا گناہ شرک کو سمجھا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے۔

بے شک اللہ تعالیٰ اس جرم کو نہ بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اس کے سوا جس کو چاہے بخش دے گا۔ (پ 5، النسآء:48)

سیّد مبارک شاہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ذات میں شرک کرنا ممکن ہی نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کائنات کی نا دریافت وسعتیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ اس کو جاننا اور سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ اور جب تک آپ کسی ایک وجود کو مکمل جان ہی نہ سکیں تو ایسا ممکن نہیں کہ آپ اس کی ذات کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرا سکیں۔

ایمان سے آگے ہیں کہیں شرک کی منزل
وہ دوسرا دیکھے جسے پہلا نظر آئے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص385

عقیدہ توحید میں اللہ کے ساتھ ذات و صفات میں کسی کو شریک، حصہ دار یا ساجھے دار سمجھنا کفر ہے اور اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ سیّد مبارک شاہ خدا اور انسان کو یک جان دو قالب سمجھتے ہیں۔ وہ دراصل فلسفہ وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ خدا لاشریک ہے اس میں کوئی شک نہیں لیکن اس 'لا' میں کیا کیا آتا ہے یہ جاننے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ ن، م راشد نے اپنی مشہور کتاب لا = انسان کے عنوان میں انسان کو 'لا' قرار دیا۔ جب انسان یہ 'لا' ہے تو اس کا ایک مطلب یہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ یہ 'لا' خدا کی ہستی میں اس طرح شریک ہے کہ جب خدا لاشریک ہے تو 'لا' اس کل کا جزو بن جاتا ہے۔

توحید میں بھی شرک کا دعویٰ شریک ہے
میرا وجود 'لا' ہے خدا لاشریک ہے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص374

پابندِ گماں کفر ہے تسلیم و رضا بھی
بے زار ہے اس دینِ تذبذب سے خدا بھی
تردید کسی غیر کی کیا تجھ کو روا ہے
موجود ہے دنیا میں کوئی تیرے سوا بھی

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص192

تردیدِ غیر صورتِ شرکِ عظیم ہے
رکھتا ہے کوئی دہر میں تیرے سوا وجود؟
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص316

الحاد دراصل خدا سے مایوسی اور لاتعلق ہونے کے بعد پیدا ہوا۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد اس نظریے کے حامل افراد نے خدا کا وجود ماننے سے ہی انکار کر دیا۔ نظریہ الحاد کے آغاز کے بارے میں ارشد محمود لکھتے ہیں۔

"تاریخ میں الحاد کا آغاز شر کے مسئلے (Problem of Evil) سے اٹھا۔ یعنی دنیا میں پائی جانے والی برائی، ظلم اور نا انصافی کا وجود دیوتاؤں (خدا) کے تمام اثر ورسوخ کے باوجود کیونکر ہے۔"27

یہ بجا ہے کہ سائنسی انقلاب کے بعد پوری دنیا خاص طور پر مغرب میں الحاد فیشن کے طور پر نوجوان نسل میں پروان چڑھنے لگا ہے۔ جیسا کہ اقبال نے کہا تھا۔

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
(بانگ درا، ظریفانہ)

اس مذہب بیزار اور خدا بیزاری کی ایک وجہ شاید مذہب سے وابستہ افراد کی سخت مزاجی اور شدت پسندی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ ایک طویل بحث ہے۔ سیّد مبارک شاہ جدید دور کے انسان کا خدا سے تعلق ضروری قرار دیتے ہیں۔

خود کو بھی ترک کردیا تجھ کو تیاگ کر
کافر بھی ہو کے دیکھ میں مشرک ہوا نہیں
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص175

واعظ! تری حکایتِ قہر خدا بجا!
لیکن خدا گواہ کہ دل مانتا نہیں
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص189

پھر الحاد کے قائل لوگوں کا فلسفہ یہ بھی ہے کہ جو شے انسان کی دسترس سے باہر ہے اس کا وجود ماننا یا نہ ماننا ضروری نہیں۔ جو چیز حواس خمسہ اور سائنسی ایجادات سے ماپی اور دریافت نہیں کی جا سکتی وہ کیسے اتنی اہم ہو سکتی ہے۔ دراصل انسان کی اپنی حدود ہیں وہ ہر شے کا احاطہ انہی حدود کے اندر رہتے ہوئے کرتا ہے۔ ارشد محمود اس سلسلے میں کہتے ہیں:

"ظاہر ہے انسان کی جو بھی Definition کرے وہ اپنی دیکھی دنیا سے باہر اس کا کوئی تصور نہیں باندھ سکتا۔"28

کیا دیکھے گا جس نے اپنی آنکھوں پر
بینائی کا پردہ پہنا ہوتا ہے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص61

مختصر الفاظ میں الحاد کا مطلب ہے یہ
آئنہ منکر ہوا ہے اصل کی رعنائی کا

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص46

ہم اپنی ذات کے کافر

ہم اپنی کم نگاہی کا
عجب اظہار کرتے ہیں
کہ جو آنکھوں سے اوجھل ہو
اسے تسلیم کرنے سے سدا انکار کرتے ہیں

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص237

سیّد مبارک شاہ جدید دور کے انسان کے طور پر خود کو تشکیک سے نہیں بچا سکتے۔ وہ خود بھی خدا کے وجود اور اس کے حصول پر سوال اٹھاتے ہیں لیکن ان کے اندر عقیدے اور عقیدت کا جذبہ کہیں ماند نہیں پڑتا۔ گویا یہ ایک ایسے انسان کا بیانیہ ہے جو سائنسی طرز فکر سے بھی آگاہ ہے اور روحانی طور پر بھی خود کو مابعد الطبیعاتی عناصر سے جوڑے رکھنا چاہتا ہے۔ بقول ڈاکٹر اختر بستوی:

"تشکیک جو نسبتاً وسیع تر مفہوم میں استعمال ہو سکتی ہے ایک عام ذہنی رویہ ہے۔ علمیا تیلی مابعد الطبیعاتی نظریہ نہیں، یہ ایسا مثبت اور صحت مند رجحان ہے جو تمام رائج الوقت فلسفوں اور اقدار کو شک کی نگاہ سے دیکھتا انھیں جانچتا اور پرکھتا ہے تاکہ حقیقت کی ماہیت اور تہہ تک پہنچ سکے۔"29

رکھتا نہیں ہے ذہن میں گرچہ خدا وجود
دل میں دھڑک رہا ہے مگر اس کے باوجود
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص53

جو تجھ کو تیرے ہونے سے کہتے ہیں ماورا
ان پر لگی ہے تہمتِ الحاد کیا کریں
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص483

مرے الحاد کو قائم ہمیشہ اے خدا رکھنا
تمہارے نام کو قائم مرا الحاد رکھے گا
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص497

"سیّد مبارک شاہ کی بیشتر شاعری خدا، انسان اور کائنات کے گرد گھومتی ہے۔ ان کی شاعری کی اساس فکر ہے۔ اپنی فکر میں وہ خاصی بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کبھی ایقان تو کبھی تشکیک کے کسی پہلو کا اظہار ان کے ہاں بار بار نمودار ہوتا ہے۔ 30"

سر سیّد احمد خان کا حوالہ مسلمانان برصغیر کے لیے اس حوالے سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ انھوں نے حکمران انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان فاصلے کم کرنے کی کامیاب سعی کی تھی۔ سیّد مبارک شاہ بھی اسی طرح جدید دور کے خدا بیزار انسان کو خدا سے ملانے اور دونوں کے مابین فاصلے کم کرنے کا کریڈٹ رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک طرف تو خدا سے تعلق کے لیے انسان کو قائل کیا جاتا تو دوسری طرف خدا سے بھی انسان کی سفارش کی گئی ہے۔ گویا دونوں طرف کی دوریاں مٹانے کا بیڑہ شاعر اٹھاتا ہے۔

قرآن کے حوالہ جات

علامہ اقبال کی طرح سیّد مبارک شاہ کی شاعری کا خمیر کتاب اللہ سے اٹھا ہے۔ قرآن مجید

سے ان کے لگاؤ کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ وہ کسی ایک مترجم یا مفسر تک خود کو محدود نہیں رکھتے تھے بلکہ تمام میسر تراجم اور تفاسیر کا مطالعہ ان کا روز مرہ کا معمول تھا۔راقم نے سیّد مبارک شاہ کا زیر استعمال نسخہ دیکھا تو اس میں کئی کئی صفحات پر حاشیے میں نوٹس تحریر تھے۔اس حوالے سے محمود اسلم للہ کہتے ہیں:

"میں نے راتوں کو دیر گئے مبارک شاہ کو مذہب، فلسفہ اور تاریخ کی کتابیں پڑھتے، قاری عبدالباسط کی آواز میں قرات قرآن، اور مختلف پڑھنے والوں کی آواز میں امراؤ قیس کی شاعری سنتے دیکھا۔" 31

وہ قرآن مجید سے کتنا لگاؤ رکھتے تھے اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے ہوتا ہے۔

"قرآن، بابے اور اقبال میری شاعری کا سورس ہیں۔" 32

سیّد مبارک شاہ کی کتابوں میں قرآنی حوالے جا بجا ملتے ہیں۔ان میں چند اہم حوالہ جات درج ذیل ہیں:

سورۃ الفیل

سورہ کہف قرآن کی مکی صورت ہے اس میں ایک رکوع اور پانچ آیات ہیں۔اس سورہ میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا ﴿1﴾ کیا ان کا داؤں غلط نہیں کیا؟ (گیا) ﴿2﴾ اور ان پر جھلڑ کے جھلڑ جانور بھیجے ﴿3﴾ جو ان پر کھنگر کی پتھریاں پھینکتے تھے ﴿4﴾ تو ان کو ایسا کر دیا جیسے کھایا ہوا بھس ﴿5﴾

ترجمہ: فتح محمد جالندھری

قرآن کی اس سورہ میں ابرہہ کے مکہ پر حملے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔سیّد مبارک شاہ اپنی نظم کا عنوان سورۃ الفیل کے پہلے دو الفاظ پر رکھتے ہیں جو کہ "الم ترکیف" ہیں جس کا مطلب ہے" کیا تم نے نہیں دیکھا"۔ اس میں کفار مکہ کو مخاطب کیا گیا ہے کہ خدا نے کیسے اپنے گھر کو دشمن سے محفوظ رکھا اور خدائی امداد بھیجی۔کیا تم نے نہیں دیکھا استہزائی انداز ہے۔سیّد مبارک شاہ دنیا میں

ہونے والے ظلم و جبر کے بازار برپا ہونے پر خدا سے استفسار کر رہے ہیں کہ "کیا تم نے نہیں دیکھا؟"۔

الم ترکیف

جس گھڑی

میرے شہروں کی بستی ہوئی بستیاں

قتل کر دی گئیں

خوں سے بھر دی گئیں

کیا وہ لمحہ بھی تیری ہی تخلیق تھا

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص118

سورۃ العصر

سورۃ العصر قرآن کی مکی صورت ہے اس میں ایک رکوع اور تین آیات ہیں۔اس سورہ کی پہلی دو آیات میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے:

عصر کی قسم ﴿1﴾ کہ انسان نقصان میں ہے ﴿2﴾

ترجمہ: فتح محمد جالندھری

قرآن مجید کی اس مختصر سورۃ میں انسان کی فطرت اور تاریخ کا مختصر ترین خلاصہ کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے مختصراً انسان کو خسارے میں بتایا ہے۔سیّد مبارک شاہ اپنے ایک شعر میں ان آیات کا حوالہ یوں دیتے ہیں:

کس نے رکھا ہمیں خسارے میں
کس نے کھائی قسم زمانے کی

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص209

سورۃ قٓ

سورہ ق قرآن کی مکی صورت ہے اس میں 3 رکوع اور 45 آیات ہیں۔اس سورہ میں اللہ تعالیٰ جہنم کی تباہ کاریوں کا ذکر کرتا ہے۔ سیّد مبارک شاہ نے اس سورہ کی تضمین لکھی ہے۔اس سے رموز بے خودی میں اقبال کی تحریر کردہ سورۃ الاخلاص کا تصور ذہن میں آتا ہے۔ سیّد مبارک شاہ اپنی اس غزل میں اس سورۃ کی آیات کے حوالے دیتے ہیں:

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿16﴾

اور ہم اس کی رگ جان سے بھی اس سے زیادہ قریب ہیں ﴿16﴾

يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَئْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ﴿30﴾

اس دن ہم دوزخ سے پوچھیں گے کہ کیا تو بھر گئی؟ وہ کہے گی کہ کچھ اور بھی ہے؟ ﴿30﴾

ترجمہ: فتح محمد جالندھری

ان آیات کا حوالہ وہ اپنے اشعار میں یوں دیتے ہیں:

کچھ تو علاجِ وحشتِ ھل من مزید کر
فردوس کو سجا کے جہنم رسیّد کر
شہ رگ کو چھوڑ کر مرے سینے سے لگ کبھی
دل میں قیام ساکنِ حبل الورید کر

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص213

وہ قرآن مجید کی تفہیم خود کرنے پر زور دیتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان خود قرآن پر تحقیق کر کے اپنے سوالات کے جوابات پا سکتا ہے۔ محض دوسروں کی تفاسیر پر اکتفانہ کیا جائے۔اسی لیے وہ کہتے ہیں:

کرتے ہیں ابنِ جہل کیوں اس کی وضاحتیں
اپنی زباں سے شرحَ کلامِ مجید کر

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص213

سورۃ الرحمٰن

سورۃ الرحمٰن قرآن کی مکی صورت ہے اس میں 3 رکوع او78 آیات ہیں۔ یہ سورہ قرآن مجید کی دلہن کہلاتی ہے۔ اس نظم میں اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے:

جو (مخلوق) زمین پر ہے سب کو فنا ہونا ہے ﴿26﴾ اور تمہارے پروردگار ہی
کی ذات (بابرکات) جو صاحب جلال و عظمت ہے باقی رہے گی ﴿27﴾

ترجمہ: فتح محمد جالندھری

حسین بن منصور حلاج کے قتل پر تبصرہ کرتے ہوئے سیّد مبارک شاہ نے ایک نظم " حسین بن منصور کی ایک نظم " کے نام سے لکھی۔ اس میں حسین بن منصور کی طرف سے اپنے فنا کیے جانے کے فیصلے پر ایک استغاثہ ہے۔

جو کل من علیھا فان کہتا ہے

وہ رہتا ہے

تو دیکھے گا

پہاڑوں سے سمندر کو

جو دریا جذب کرتا ہے

سمندر میں

وہی مجذوب دریا آن بہتا ہے

جو کل من علیھا فان کہتا ہے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 374

سورۃ صٓ

قرآن مجید اس مکی سورہ میں 82 آیات اور 5 رکوع ہیں۔ اس سورہ میں جہاں ابلیس کے آدم کو سجدہ نہ کرنے کا ذکر ہے ان آیات کا حوالہ سیّد مبارک شاہ کی ایک نظم " الا ابلیس " میں ملتا

ہے۔اس نظم کا ذیلی عنوان اسی سورہ کی آیت نمبر 84 ہے۔اس واقعے سے متعلق آیات میں اللہ تعالی فرماتا ہے:

جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے انسان بنانے والا ہوں ﴿71﴾ جب اس کو درست کرلوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا ﴿72﴾ تو تمام فرشتوں نے سجدہ کیا ﴿73﴾ مگر شیطان اکڑ بیٹھا اور کافروں میں ہوگیا ﴿74﴾ خدا نے) فرمایا کہ اے ابلیس جس شخص کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اس کے آگے سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے منع کیا۔ کیا تو غرور میں آگیا یا اونچے درجے والوں میں تھا؟ ﴿75﴾ بولا کہ میں اس سے بہتر ہوں (کہ) تو نے مجھ کو کو آگ سے پیدا کیا اور اِسے مٹی سے بنایا ﴿76﴾ فرمایا یہاں سے نکل جا تو مردود ہے ﴿77﴾ اور تجھ پر قیامت کے دن تک میری لعنت (پڑتی) رہے گی ﴿78﴾ کہنے لگا کہ میرے پروردگار مجھے اس روز تک کہ لوگ اٹھائے جائیں مہلت دے ﴿79﴾ فرمایا کہ تجھ کو مہلت دی جاتی ہے ﴿80﴾ اس روز تک جس کا وقت مقرر ہے ﴿81﴾ کہنے لگا کہ مجھے تیری عزت کی قسم میں ان سب کو بہکاتا رہوں گا ﴿82﴾ سوا ان کے جو تیرے خالص بندے ہیں ﴿83﴾ فرمایا سچ (ہے) اور میں بھی سچ کہتا ہوں ﴿84﴾

ترجمہ: فتح محمد جالندھری

اس آخری آیت کا حوالہ دیتے ہوئے اقبال کی طرح سیّد مبارک شاہ بھی ابلیس کو " امام العاشقین" قرار دے رہے ہیں۔اس نظم میں وہ کہتے ہیں:

اِلّا اِبلیس

جس نے مٹّی کے بُت کو نہ سجدہ کیا

روزِ اوّل سے جو منکرِ شرک تھا

جُز ترے جس کی نظروں میں کوئی نہ موجُود تھا

تیرا مردُود تھا؟

جس کے پیشِ نظر تیری تقدیس تھی

کس قدر وُسعت ظرفِ ابلیس تھی

سینۂ آدمی کا ہر اک وسوسہ

جس سے منسُوب ہے

تیرا معتُوب ہے ؟

! ہے تو ہو گا، مگر مُنصفِ دو جہاں

اُس کے دِل کی خَلِش کس کے سَر جائے گی

جس نے ہر حال میں تیری لوحِ ازل کا بھرم رکھ لیا

جس نے تیرے لیے بے طلب راستوں پر قدم رکھ لیا

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 158

اس کے علاوہ نظم "گماں" میں سورہ الکہف، نظم "ابتلا" میں سورہ الدہر، نظم "اندھیر میں" سورۃ الانعام، نظم "تلاش" میں سورۃ التین، نظم "ایک دعا" میں سورۃ النور اور اپنی کتاب "ہم اپنی ذات کے کافر" کا آغاز سورۃ الانفطار کی آیت "یا ایھا الانسان ما غرک بربک الکریم" سے کیا۔ ان کی ایک نظم کا عنوان "اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ" ہے۔

حوالہ جات

1۔ محمد طیب ابدالی، ڈاکٹر، اردو میں صوفیانہ شاعری، اسرار کریمی پریس، الٰہ آباد، 1984، ص67

2 سلطان ناصر، تیسرے جہان کی تلاش، کلیات سیّد مبارک شاہ، جہلم بک کارنر، جہلم، 2017،

ص13

3۔ ارشد محمود، تصور خدا، گورا پبلشرز، لوئر مال، لاہور 1997، ص15

4۔ سلطان ناصر، تیسرے جہان کی تلاش، کلیات سیّد مبارک شاہ، جہلم بک کارنر، جہلم، 2017،

ص11

5۔ مبارک شاہ، سیّد، برگد کی دھوپ میں، سروش پبلی کیشنز، فیصل آباد، 2000ء، ص103

6۔ مبارک شاہ، سیّد، برگد کی دھوپ میں، سروش پبلی کیشنز، فیصل آباد، 2000ء، ص106

7۔ ایضا"

8۔ مبارک شاہ، سیّد، دیباچہ جنگل گمان کے، کلیات سیّد مبارک شاہ، جہلم بک کارنر، جہلم، 2017، ص36

9۔ سلطان ناصر، تیسرے جہان کی تلاش، کلیات سیّد مبارک شاہ، جہلم بک کارنر، جہلم، 2017،

ص14

10۔ ایضا"، ص18

11۔ ارشد محمود، تصور خدا، گورا پبلشرز، لوئر مال، لاہور 1997، ص54

12۔ ایضاً، ص114

13۔ ایضاً، ص47

14۔ کیلانی، مولانا عبدالرحمٰن، دین طریقت کے نظریات وعقائد، مکتبۃ السلام، لاہور، 2009، ص15۔ سلطان ناصر، تیسرے جہان کی تلاش، کلیات سیّد مبارک شاہ، جہلم بک کارنر، جہلم، 2017،

ص14

16۔ ایضاً ص17

17۔ وحید احمد، ڈاکٹر، انٹرویو از راقم، بمقام راولپنڈی، بروز سوموار، 30 دسمبر 2019، رات 9 بجے

18۔ محمد ارشد، مدارِ نارسائی میں (سیّد مبارک شاہ) کا تجزیاتی مطالعہ، مقالہ ایم اے اردو مملوکہ گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج، بہاول پور، 2012ء، ص21

19۔ جام حفیظ لاڑ، انٹرویو از محمد ارشد، بمقام رحیم یار خان، بروز بدھ، 25 مارچ 2012، شام 6 بجے

20۔ مبارک شاہ، سیّد، برگد کی دھوپ میں، سروش پبلی کیشنز، فیصل آباد، 2000ء، ص130

21۔ ایضاً، ص135

22۔ محمد ارشد، مدارِ نارسائی میں (سیّد مبارک شاہ) کا تجزیاتی مطالعہ، مقالہ ایم اے اردو مملوکہ گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج، بہاول پور، 2012ء، ص93

23۔ یوسف حسین خاں، ڈاکٹر، اردو غزل، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، 1996، ص312

24۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو ادب میں طنز و مزاح، سنگ میل، لاہور، ص318

25۔ مبارک شاہ، سیّد، برگد کی دھوپ میں، سروش پبلی کیشنز، فیصل آباد، 2000ء، ص144

26۔ ارشد محمود، تصور خدا، گوراپبلشرز، لوئر مال، لاہور 1997، ص47

27۔ ارشد محمود، تصور خدا، گوراپبلشرز، لوئر مال، لاہور 1997، ص46

28۔ ارشد محمود، تصور خدا، گوراپبلشرز، لوئر مال، لاہور 1997، ص80

28۔ ارشد محمود، تصور خدا، گوراپبلشرز، لوئر مال، لاہور 1997، ص79

29۔ اختر بستوی، ڈاکٹر، سیکولرزم اور اردو شاعری، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو، 1996، ص541

30۔ محمد ارشد، مدارِ نارسائی میں (سیّد مبارک شاہ) کا تجزیاتی مطالعہ، مقالہ ایم اے اردو مملوکہ گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج، بہاول پورِ، 2012ء، ص12

31۔ محمود اسلم للہ، دیباچہ، مدار نارسائی میں، بک ہوم پبلشرز، لاہور، 2010ء، ص15

32۔ سعدیہ عاشق، سیّد مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ (مقالہ برائے ایم اے اردو)، مملوکہ شعبہ اردو نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، 2014-2016،، ص19

باب سوم

سیّد مبارک شاہ کی شاعری میں کونیات

سیّد مبارک شاہ کی شاعری میں کونیات

خالق نے انسان کی فطرت میں جو پارہ صفتی کا عنصر رکھا ہے اسے انسان کی اب تک کی ترقی میں بنیادی دخل ہے۔ انسان کا یہ اضطراب، بے چینی اور تجسس اسے نئی دنیا تلاش کرنے پر اکساتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان نے جنگل اور پتھر سے زمانوں تک خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ اب وہ نئی آبادیوں کی تلاش میں سرگرم عمل ہے۔

انسان کے ذات کو اگر دو حصوں میں تقسیم کیا جائے تو وہ اس کی تعقل پسندی اور جذبات و احساسات ہیں۔ ایک طرف انسان مشین سے زیادہ میکانکی انداز رکھتا ہے تو دوسری طرف اس کا دل جذبات کی آماج گاہ ہے۔ گویا یہ عقل و دل کا پیکر اس آگ اور پانی سے کھیلتا ہوا ترقی کی منزلوں کو سر کرتا چلا جا رہا ہے۔ شاعری اسی جذبہ و احساس کی دین ہے۔ شاعری انسان کا باطنی اظہار ہے۔ انسان کی ذات کے خفتہ رازوں کو کھولنے کا عمل شاعری کہلاتا ہے۔

ہمارے یہاں یہ عام تاثر ہے کہ سائنس اور ادب شاید بعد مشرقین رکھتے ہیں۔ اس عقل و دل کی آپس میں ٹھنی ہی رہتی ہے۔ لیکن دراصل ایسا نہیں ہے۔ سائنس اور شاعری میں کئی اشتراکات ہیں بقول شاہد ماکلی:

> "اس میں کلام نہیں کہ شاعری اور سائنس کے درمیان گہرا تعلق ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے مربوط ہیں کیوں کہ دونوں کائنات اور انسانی بقا کی اصل تک پہنچنے میں کوشاں ہیں۔ دونوں میں کئی باتیں مشترک ہیں مثلاً" دونوں کا سفر نادریافت سے دریافت، ناایجاد سے ایجاد اور نامعلوم سے معلوم کی طرف ہے۔ اس سارے تخلیقی سفر میں دونوں کے پاس سب سے برا زادِ سفر قوتِ متخیلہ ہے۔ دونوں کا سب سے بڑا فکری ماخذ، موضوع اور سورس آف انسپائریشن فطرت ہے۔" 1

یعنی شاعری اگرچہ جذبے سے پیدا ہوتی ہے لیکن قوت متخیلہ شاعری اور سائنس دونوں میں بنیادی قدر مشترک ہے۔ انسان کی معلوم تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انسان نے ہمیشہ نامعلوم کو معلوم کرنے کی سعی کی ہے۔ تھیلیز کی زندگی کا مادہ دریافت کرنے کی سعی سے آج کے جدید انسان کی نئی کائناتیں دریافت کرنے کی للک میں بنیادی حصہ اسی فطرت کا ہے جس نے انسان کو سوچنا سکھایا۔ ڈاکٹر محمد نوید کہتے ہیں:

" شاعر اور سائنس دان دونوں میں قدر مشترک وہ حقیقی سچائی جس کی تلاش میں دونوں سرگرداں ہوتے ہیں۔ سائنس دان لیبارٹری میں کائنات کے ثبات اور ناثباتی کی جنگ لڑتا ہے اور شاعر اپنی ذات میں کائنات کی الجھنوں میں گرفتار رہتا ہے۔احساس کی سطح پر دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔" 2

انسان کی قوت متخیلہ سے تمام علوم نے جنم لیا۔انسان نے ہمیشہ کچھ نیا کرنے کی ٹھانی ہے۔اپنے خالق کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس پیکر خاکی نے ہمیشہ نت نئی دریافت اور ایجاد سے اپنی زندگی کو آسان بنایا ہے۔خاص طور پر ایک شاعر کے ہاں یہ تجسس اپنی عظیم ترین شکل میں ہوتا ہے۔وہ اس قوت متخیلہ سے ایسے مضامین بھی شعر میں ڈھالتا ہے جن کو معلوم علوم سے جانچنا بھی بعض اوقات مشکل ہو جاتا ہے۔بقول گوپی چند نارنگ

"شاعری یا تخلیق کا مرتبہ ہر شے سے بلند اس لیے ہے کہ شاعر کے تخیل کا پرواز چشم زدن میں ان افلاک سے بھی آگے نکل جاتا ہے اور ایسے ایسے حقائق کا اکتشاف کر لیتا ہے جہاں تک پہنچنے کے میں تعقل کو ارتقائی سفر طے کرنے میں صدیاں لگتی ہیں۔" 3

ہمارے ہاں سائنس اور ادب کو دو مختلف زاویہ ء حیات کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ادب کا طالب علم بنیادی سائنسی معلومات سے نابلد ہوتا ہے اور سائنس کا طالب علم ادب کی لطیف کیفیات سے لطف انداز نہیں ہو سکتا۔لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ادب کا طالب علم سائنسی شعور نہیں رکھتا اور سائنسی علوم کا جو یا جذبات و احساسات سے قطعا" عاری ہوتا ہے۔دراصل ہر انسان بنیادی طور پر سائنس دان ہی ہوتا ہے جیسا کہ آئن سٹائن بچے کو ننھا سائنس دان (Little Scientist) کہتا ہے۔کیوں کہ ایک بچہ جس تجسس سے دنیا کو دریافت کرتا ہے یہی عمل ایک سائنس دان سرانجام دیتا ہے۔اسی طرح ہر انسان کی زندگی غم و اندوہ اور خوشی و مسرت کا مجموعہ ہوتی ہے۔وہ شاعر ہو یا عام آدمی وہ جذبات و احساسات سے عاری نہیں ہو سکتا۔گویا ادب و سائنس کا درمیانی رشتہ قائم و دائم رہتا ہے۔

"ادب اور سائنس سطحی طور پر دو ایسی حقیقتیں نظر آتی ہیں جن میں بعد المشرقین ہو لیکن نظر غائر سے آپ دیکھیں تو دونوں خیالات اور قلب کی کیفیات ہیں۔دونوں فطرت کے حسن کے متلاشی ہیں۔ایک فطرت کو اپنے مطالعہ، تحلیل، تحلیل اور پیمائش سے ایک نظریہ یا مساوات کی شکل میں ظاہر کرتا ہے اور دوسرا

فطرت کے حسن کو اپنے شعر میں ڈھال لیتا ہے۔یہ قلبی کیفیت عین الہامی ہو گی، شعر میں بھی سائنسی الہامیت آ جاتی ہے۔"4

شاہد ماکلی لکھتے ہیں:

"فی زمانہ جدید سائنس اور جدید شاعری ایک دوسرے کی حریف نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر نت نئی کائناتوں کی کھوج میں سرگرداں ہیں۔دونوں کا سب سے برا محرک نیچر ہے۔نیچر، قدرت یا فطرت کے اسرار تک رسائی کا تجسس ہی انھیں آگے سے آگے رواں دواں رکھتا ہے۔"5

سائنس اور شاعری کے درمیان ایک اور قدر مشترک وہ فکر ہے جس سے یہ دونوں جنم لیتے ہیں۔دونوں انسان کو مشکلات سے نکالنے اور اس کی زندگی آسان بنانے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ایک شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے عہد کے علوم سے نا صرف واقف ہو بلکہ صاحب رائے بھی ہو۔اردو میں غالب اور اقبال نے عصری سائنسی شعور کے تمام تقاضے بخوبی پورے کیے ہیں۔بڑا شاعر اپنے عہد کا عکاس تبھی بن سکتا ہے جب وہ مکمل طور پر اس عہد کے مسائل سے آگاہ ہو اور عصری علوم کی نئی جہتوں سے روشناس ہو۔کیوں کہ بڑی شاعری بڑے کینوس کا تقاضا کرتی ہے۔

"کسی بھی زبان کے بلند پایہ ادیب اور شاعر زمانے کے نبض شناس ہوتے ہیں۔وہ ماضی اور حال سے واقف، بہتر مستقبل کے نقیب ہوتے ہیں۔بدلتے ہوئے تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور سماجی حالات کو تیزی کے ساتھ بھانپ لیتے ہیں۔ان کی تخلیقات ،آفاقی، زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہوتی ہیں۔جو نہ صرف تخلیق کار کے عہد کی آئینہ دار ہوتی ہیں بلکہ آنے والے عہد پر اثر انداز بھی۔"6

اگر اکیسویں صدی کا شاعر عصری سائنسی شعور نہیں رکھتا تو اس کی شاعری میں وہی موضوعات اور مسائل بیان ہوں گے جو شاید اڑھائی سو سال پہلے میر تقی میر کو درپیش تھے۔آج کا انسان سائنسی ترقی اور اس کے ثمرات سے اس قدر متاثر ہے کہ اس کی زندگی کا ہر پل کسی نہ کسی حوالے سے جدید علوم کی ترقی سے جڑا ہوا ہے۔جدید انسان کو درپیش مسائل وہ نہیں ہیں جو پچاس سو سال پہلے درپیش تھے۔آج کا ان پڑھ انسان بھی جدید علوم کی دریافتوں اور ایجادات سے براہ راست فیض کشید کر رہا ہے تو اس کی شاعری میں اس کاردِ عمل کسی نہ کسی شکل میں ضرور سامنے آنا چاہیے۔

شاہد ماکلی کہتے ہیں:

"جدید سائنس نے ذات و کائنات سے متعلق ہمارے علم اور آگاہی کو وسیع اور متنوع کر دیا ہے۔ چناں چہ ہمارے طرزِ فکر میں بھی توسع اور تنوع پیدا ہوا ہے جس کا براہِ راست اثر ہماری شاعری پر بھی پڑا ہے۔ گویا سائنس نے ہماری زندگی کے ساتھ ساتھ ہمارے شعری روّیوں کی بھی تنظیمِ نو کی ہے۔ سائنسی عہد کا شاعر اپنے روّیوں، طرزِ فکر، داخلی و خارجی تجربات اور اپنی حسّیات و کیفیات میں پیچیدہ ہے، تو پھر اس کی شاعری کے موضوعات اور شاعری میں اس کا طرزِ اظہار سادہ اور سطحی کیسے ہو سکتا ہے؟"7

اس وقت تمام علوم کو یکجا کرنے پر زور دیا جا رہا ہے۔ دراصل سائنس تلاش کے عمل کو کسی ایک نکتے پر سمیٹنا چاہتی ہے۔ دنیا کے گلوبل ویلیج بلکہ گلوبل روم بننے کے بعد جو فاصلے تہذیبوں کے اختلاف سے موجود تھے اب وہ آہستہ آہستہ ختم ہو رہے ہیں۔ تمام انسان، تمام نظریے اب ایک آواز میں ڈھل رہے ہیں۔ "ہم ایک: ہمارا ایک" وہ فکری اتصال ہے جس کا شکار کرہ ارض کے تمام انسان ہو رہے ہیں۔ اب سائنس، ادب، فلسفہ، مذہب اور تمام علوم کو کسی ایک منطقی نتیجے تک پہنچنا ہو گا۔

"آج کائناتی تناظرات کی تکثیریت کا او ایک نکتہ وحدت پر لانے کا خواب ایک جدید سائنس دان بھی دیکھ رہا ہے اور جدید شاعر بھی۔ سائنس کے لیے یہ تھیوری آف ایوری تھنگ کی تلاش کا دور ہے۔ شاعری کے لیے یہ پوئٹری آف ایوری تھنگ کی جدوجہد کا عہد ہے۔ جدید سائنس کا یہ امتزاجی رویہ اسے بے کراں کائناتوں کی لا متناہ بو العجبیوں کے ایک سادہ ترین ریاضیاتی حل تک پہنچا سکتا ہے اور جدید شاعری کا امتزاجی رویہ اسے ایک بہت بڑے معنوی پھیلاؤ کو سمیٹنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔"8

سائنس عقل کی شاعری کا نام ہے۔ اگر سائنس میں جذبے کی حدت شامل کر لی جائے تو اسے شاعری سے الگ نہیں کیا جا سکے گا۔ ایک عمدہ شاعر ہمیشہ اپنے شعر میں سائنسی شعور کا اظہار ضرور کرتا ہے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مستقبل میں شاعری اور سائنس کے میدان الگ الگ نہیں ہیں۔ ان دونوں کا اتصال انسان کی ترقی کا ضامن ہے۔

بقول شاہد ماکلی

" اگر سائنس ہمارے جذبات و احساسات میں ہلچل مچاتی ہے اور ہمارے دل میں کیفیت اور گداز پیدا کرتی ہے تو یقین کیجیے کہ اس مقام پر سائنس سائنس نہیں رہتی بلکہ شاعری بن جاتی ہے۔ انسلاک و اشتراک کہ یہی وہ سرحد ہے یہی وہ نقطہ ء اتصال ہے جہاں سائنس اور شاعری کی دوئی ختم ہو جاتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر انجان دنیاؤں کی سیر کو نکل پڑتی ہیں۔"9

سیّد مبارک شاہ کا سائنسی شعور

سیّد مبارک شاہ کی شاعری سوال اٹھاتی ہے اور سائنس میں سوالات اٹھانا بنیادی معاملہ ہے۔ سوال اٹھانا کسی بھی سائنسی عمل کی بنیاد ہوتا ہے۔ جب ہم سائنسی طریقہ کار (Scientific Method)کا مطالعہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے "مشاہدہ" آتا ہے۔ مشاہدہ عام انسان کو خاص انسان سے الگ کرتا ہے۔ دنیا میں کئی ایجادات روزمرہ اشیاء کو نئے نظریے اور نئے زاویے سے دیکھنے کے نتیجے میں معرض وجود میں آئیں۔ اگر یہ صاحب نظر لوگ موجود نہ ہوتے تو کبھی سائنس سپر کمپیوٹر تک نہ پہنچ پاتی۔ سیّد مبارک شاہ اسی بات کو یوں بیان کرتے ہیں:

تحیر شیوہ پیمبری ہے اور پیمبر نے
ستارہ دیکھ کر سوچا کہ شاید یہ خدا ہو گا
تفکر ہو تو اک لمحے کی بینائی غنیمت ہے
وگرنہ سیب ٹہنی سے تو پہلے بھی گرا ہو گا

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 232

ان دو اشعار میں آپ کو ایک صوفی اور سائنس دان میں مماثلت نظر آئے گی۔ جیسے ایک صوفی کائنات کے مظاہر میں خدا کو تلاش کرتا ہے بالکل اسی طرح ایک سائنس دان ٹہنی سے سیب گرتا دیکھ کر کشش ثقل دریافت کر لیتا ہے۔ ان دو اشعار سے ہمیں اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے ایک پڑھا لکھا انسان جب تصوف کی وادیوں میں قدم رکھتا ہے تو وہ ایک سائنس دان کی طرح نئے جہاں خود پر روشن کرتا چلا جاتا ہے۔ اشفاق احمد کے ڈرامے " من چلے کا سودا" میں جب ایک پروفیسر ایک بابے سے خدا کو پانے کا طریقہ پوچھتا ہے تو بابا اسے سائنس اور فزکس پڑھنے کا مشورہ دیتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ اس دور میں جدید سائنسی علوم پڑھے بغیر آپ خدا تک نہیں پہنچ پاتے۔

سیّد مبارک شاہ کی شاعری میں آپ کو "جنگل گمان کے" سے ہی سائنسی حوالہ جات ملنے شروع ہو جاتے ہیں لیکن مدار نارسائی تک یہ معاملہ جدید سائنسی و کونیاتی مباحث تک جا پہنچتا ہے۔ اس حوالے سے سلطان ناصر لکھتے ہیں:

"سیّد مبارک شاہ جیسے دقیق نظر شاعر کا اپنے معاصر فلسفیانہ، ادبی اور سائنسی رویوں سے اثر قبول کرنا ایک فطری بات ہے۔ تاہم انھیں واضح طور پر کسی معاصر تحریک سے جوڑ دینا درست نا ہو گا۔ ان کے ہاں موجودیت، بے معنویت، تجریدیت، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ ۔۔ان نظموں کا موضوع بے انت زمان و مکاں اور ان میں انسانی وجود (وعدم) کا مخمصہ ہے۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا متلاشی خود کو مذہب، فلسفہ اور سائنس کے سہ راہے پر کھڑا پاتا ہے اور شاہ جی تو ان تینوں راہوں کے باقاعدہ مسافر ہیں۔ ہاں، ان معاملات میں انھوں نے سوالوں کے جواب نہیں بلکہ جوابوں کے سوال ڈھونڈے ہیں۔ ۔۔ مزید برآں، شاہ جی نے کہیں کہیں معلوم سائنسی مسائل کی ابحاث بھی چھیڑی ہیں اور سائنس کو ایسا دلکش پیراہن تغزل عطا کیا ہے کہ بایدو شاید۔"10

سائنسی موضوعات پر جو اشعار سیّد مبارک شاہ نے لکھے ہیں ان میں سے چند ایک کا تذکرہ ہم یہاں بلحاظ موضوع کریں گے۔

بگ بینگ

یہ ابتدائے آفرینش کا ایک مقبول سائنسی نظریہ جسے اب بلا کم و کاست کے مانا جاتا ہے۔ سائنس دان یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا ایک عظیم دھماکے کے بعد معرض وجود میں آئی ہے۔ کائنات میں ایسے دھماکے آتے رہتے ہیں۔ یہ ایک کائناتی حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ سیّد مبارک شاہ لکھتے ہیں:

ساعتِ روزِ ازل ہو کہ قیامت کی گھڑی
حادثہ کوئی زماں گیر نہیں ہو سکتا

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص107

ہمیں نابود مت کرنا

کہ جب تقسیم ہونے کا عمل ممکن نہیں رہتا

تو پھر ذرہ ذرا بھر چوٹ کھانے پر

دھماکے کو اگلتا ہے

دھماکے کو سمجھتے ہو

دھماکہ جس سے حرفِ کن ٹپکتا ہے

ہمیں نابود مت کرنا

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 371

سنگِ کُن سے کرچیاں ہے آئنہ تنہائی کا
ریزہ ریزہ عکس بکھرا ہے تری یکتائی کا

کلیات مبارک شاہ، ص 46

بقول شاہد ماکلی:

فطرت کا دائرہ کار لا محدود ہے۔ شگفتِ گُل سے شکستِ دل تک، شام شہر یاراں سے زمان و مکان تک، موجِ صبا سے موجِ تجاذب تک، روئے یار کے خالِ سیاہ سے بلیک ہول تک، بگ بینک سے بگ کرنچ تک، بڑی شاعری بڑے سوالات اٹھاتی ہے۔11

خلیے کی کائنات:

سائنس کو پڑھنے کے دو طریقے ہیں ایک یہ جہان اکبر کا مطالعہ کیا جائے اسے ہم اجمالی مطالعہ (Macro study) بھی کہتے ہیں۔ یا پھر خلیاتی مطالعہ (Micro Study) جس میں جہان اصفر کی حقیقتوں کو جاننے کی سعی کی جاتی ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے اجسام پوری دنیا ہیں تبھی انھیں جہان اصغر کہا جاتا ہے۔ کیسے کائنات کا سب سے حقیر ذرہ بھی دوسری زندگیوں سے جڑا ہوا ہے۔ سیّد مبارک شاہ کے یہ اشعار دیکھیے:

ہمارا خون پینا چاہتے ہیں
عناصر ہیں جو جینا چاہتے ہیں

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 25

جھانکتی رہتی ہیں اس کی کھڑکیاں
جس مکاں کا در کھلا کوئی نہیں

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 108

سماعت ہو تو اک ناقابلِ تقسیم ذرہ تک
ذرا سی ضرب کھائے گا تو بس کوہ ندا ہو گا

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 232

قیاس

کسے خبر ہے
کہ اپنی آنکھوں میں بسنے والے
نہ جانے کتنے ہی ننھے منے جسیم تارے
ہماری نظروں سے نوری مدت کی دوریوں پر
اجڑ گئے ہیں
کسی نے دیکھا
نگاہ جن پر جمی ہوئی ہے
انھیں کے پاؤں
خلا کے فرشِ بقا سے کب کے اکھڑ گئے ہیں

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 271

ہم آدمی ہیں

درونِ شہر بدن تو ظاہر نہیں ہے لیکن
برونِ شہر بدن بھی ہم پر کہاں کھلا ہے
بدلتے خلیوں سے متصف یہ ہمارا چہرہ

جو عمر گزری ہے آئینوں میں جڑا ہوا ہے

جو لمحے لمحے میں خلیہ خلیہ بدل رہا ہے

ہمارا حلیہ بدل رہا ہے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 382

حواس خمسہ

سیّد مبارک شاہ نے حواس خمسہ کو اپنی شاعری میں صرف رسمی طور پر ہی استعمال نہیں کیا بلکہ پورے سائنسی شعور کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ حسِ سماعت اور بصارت کو ایک ماہر علوم طب کی طرح سیّد مبارک شاہ نے نہ صرف سمجھا ہے بلکہ تمام شاعرانہ لوازمات کے ساتھ شاعری کا حصہ بھی بنایا ہے۔ حس سماعت سے متعلق وہ لکھتے ہیں۔

ہماری بے بسی دیکھو

کوئی آواز دیتا ہے

تو کانوں پر سماعت قفل ہو جائے

غلافِ گوش ایسا ہے کہ بوسیّدہ سہی لیکن

کسی بھی ناشنیدہ بے صدا آواز کو احساس تک آنے نہیں دیتا

ص 336 کلیات سیّد مبارک شاہ،

سماعت رکھنے والوں کو خبر ہے
ہر اک ذرہ یہاں کوہِ ندا ہے
نظر میں کوئی تارہ ہے نہ جگنو
ہمیں سورج نے اندھا کر دیا ہے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 294

اسی طرح حس بصارت سے متعلق ان کی شاعری میں بہت حوالے ملتے ہیں۔ وہ سائنسی

موضوعات پر سب سے زیادہ روشنی (Optics) اور اس کے متعلقات پر اشعار کہے ہیں۔ کچھ حوالہ جات درج ذیل ہیں۔

میری آنکھوں کو لگی ہے ایسی سورج کی نظر
دیکھتا ہوں کہکشاؤں کو دھواں ہوتے ہوئے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص259

ستارے روشنی میں بجھ گئے ہیں
مری آنکھوں سے کیا دھوکا ہوا ہے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 297

وہ اپنی نظم "ہماری بے بسی دیکھو" میں لکھتے ہیں:

اگر ہم دیکھنا چاہیں
تو دیکھیں کہ بصیرت پر بصارت وار کر جائے
فقط دیکھے ہئے رنگوں کے عادی
یہ ہماری آنکھ کے پردے
کسی نادیدہ رنگت کا کہاں ادراک رکھتے ہیں

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 336

ارضیات (Geology)

زمین، اس کی ساخت اور اس کے اندر ہونے والی تبدیلیوں سے متعلق تحقیق ارضیات کے ماہرین کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں شاعری میں عام طور پر زمین کو محض آسمان کی ضد کے طور پر یا صرف انسان کی آماج گاہ، وطن اور دھرتی کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس کے اندر کیا کیا عالم آباد ہیں اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔ زیر زمین لاوہ، چٹانیں، معدنیات کا ایک جہان آباد ہے۔ کیسی زمین اپنی شکلیں تبدیل کرتی ہے۔

"مبارک شاہ کہتے ہیں کہ کائنات اپنی تخلیق کے بعد مسلسل عظیم تغیرات

کی حالت سے گزر رہی ہے۔ کہکشائیں راکھ ہو رہی ہیں، زمین بھڑکتے سورج سے الگ ہو کر اپنا چہرہ بدل چکی ہے، سمندر اور براعظم اپنی حالت اور مقام بدلتے رہتے ہیں اور حضرت انسان جو زمان و مکاں کے ہر آنگن میں جھانکنے کی صلاحیت رکھتا ہے اپنے علم و عرفان سے بہت نازاں ہے کہ جیسے وہ سب کچھ جانتا ہو۔"12

ہم آدمی ہیں

دہکتے لاوے کی کروٹوں نے

سمندروں کے مقام بدلے ہیں

برِ اعظم سرک گئے ہیں

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 380

بساط

نہ جانے دھرتی کے باسیوں کو

زمیں کے دامن کے تنگ ہونے کا کیوں گلہ ہے

ہماری دھرتی کے باسیوں کو خبر نہیں ہے

یہ وسعتیں تو نگاہِ مہر و نجوم میں بھی کھٹک رہی ہیں

کہ اس زمیں پر نہ جانے کتنی ہی کائناتیں بھٹک رہی ہیں

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 345

ریاضی

لامحدود کائنات میں انسان اپنے محدود وسائل اور محدود عقل و شعور کے باعث ایک خاص حد سے زیادہ نہیں جا سکتا۔ جسمانی اور فکری اعتبار سے یہ فاصلہ عبور کرنا انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی انسانی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ انسان نے کبھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ وہ جنگل اور غار سے ہوتا ہوا مریخ اور اس سے آگے کی بستیاں بسانے میں سرگرم عمل ہے۔ انسان کیسے اعداد کے چنگل میں گرفتار ہے اس کا اندازہ سیّد مبارک شاہ کی اس نظم سے بخوبی

لگایا جا سکتا ہے۔

گنتی

یہ آٹھ پہروں شمار کرنا

کہ سات رنگوں کے اس نگر میں

جہات چھ ہیں

حواس خمسہ

چہار موسم

زماں ثلاثہ

جہان دو ہیں

خدائے واحد !

یہ تیری بے انت وسعتوں کے سفر پہ نکلے ہوئے مسافر

عجیب گنتی میں کھو گئے ہیں

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 264

بہت سا کام باقی ہے

ابھی یہ زندگی کتنی ادھوری ہے

کہ جس میں رنگِ ہشتم بھی نہیں دیکھا

نہ کوئی جہت ہفتم ہے

چھٹی حس ایک دھوکا ہے

زمانے ہو گئے ہیں پانچواں موسم نہیں دیکھا

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 321

ایٹمی توانائی

پوری دنیا میں ایٹمی توانائی سب سے طاقتور ترین ذریعہء توانائی ہے۔ اکثر لوگ اقبال کے ایک شعر میں ایٹمی توانائی کے اس نظریے کی جھلک دیکھتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں:

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں
کلیات اقبال

ہماری صوفیانہ شاعری میں اس طرح کے اشارے ملنا بہت پرانی روایت ہے۔ پنجابی صوفی شعراء کے ہاں متعدد ایسے اشعار ملتے ہیں۔ مثلا" معروف سلطان باہو کی ابیات کا بہت مشہور مصرعہ ہے۔

لوں لوں دے وچ لکھ لکھ چشماں، اک کھولاں تے اک کجاں ہُو

بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شاعر کسی سائنسی مضمون کو محض وجدانی کیفیت میں یا الہامی خیال کے طور پر لکھنے کی بجائے اس کا مکمل سائنسی شعور بھی رکھتا ہو۔ اس سلسلے میں خود مبارک شاہ اپنے سفرنامے "برگد کی دھوپ میں" میں رقم طراز ہیں:

"دیانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے بارے میں بھی کچھ بتا دیا جائے۔ نظم لکھنے سے پہلے اس کا خاکہ ذہن میں ہوتا ہے مگر اس کی تعمیر کے لیے بڑے جتن کرنا پڑتے ہیں۔ مثلا'' سزائے موت پر نظم لکھنے کا خیال آیا تو کسی سزا یافتہ کے لواحقین سے ملاقات کرنا۔ ہو سکے تو Death Cells کا معاءنہ کرنا اور اگر جیل کے حکام سے اجازت ملے تو پھانسی کے تختے پر کھڑا ہونا۔ پھر اس کے کنویں میں اتر کر مراقبہ کرنا۔ نظم میں اگر کوئی سائنس سے متعلقہ مضمون در آئے تو اسے کس کر باندھنے کے لیے Botany،Biology یا فزکس کی کتابوں سے رجوع کرنا کہ کہیں کوئی ایسی بات نہ لکھ دی جائے جس پر نقاد کی نگاہ سے پہلے متعلقہ اہل علم کی نظر پر جائے۔"13

ایٹمی توانائی کی تھیوری کے اشارے مبارک شاہ کے ہاں واضح دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ہمیں نابود مت کرنا

کہ جب تقسیم ہونے کا عمل ممکن نہیں رہتا

تو پھر ذرہ ذرا بھر چوٹ کھانے پر

دھماکے کو اگلتا ہے

دھماکے کو سمجھتے ہو

دھماکہ جس سے حرفِ کن ٹپکتا ہے

ہمیں نابود مت کرنا

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 371

کیا کچھ توڑا جا سکتا ہے

ذرے کا اکِ ریزہ توڑ کے عالم توڑا جا سکتا ہے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 404

سماعت ہو تو اک ناقابلِ تقسیم ذرہ تک
ذرا سی ضرب کھائے گا تو بس کوہ ندا ہو گا
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 232

حیاتیات:

حیاتیات کا شاعری سے علاقہ ضرور ہے۔علوم طب کے حوالے بھی آپ کو کلاسیکی شاعری میں مل جاتے ہیں۔ اس کا اظہار چاہے روایتی ہی کیوں نہ ہو لیکن طبیب، مرض، تشخیص، نبض، دردِ دل ، آنکھ ، کان اور دیگر اعضائے انسانی کا شاعری میں استعمال اناٹومی اور حیاتیات کے میدانوں میں آپ کو لے جاتی ہے۔ سیّد مبارک شاہ انسان کو جہانِ اصغر سمجھتے ہیں۔ وہ انسانی زندگی اور جسمانی

تبدیلیوں کو اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہیں۔ مثلاً" اپنی ایک نظم "ارتقاء" میں وہ انسان کی زندگی کا حیاتیاتی مطالعہ کرتے نظر آتے ہیں۔

خاک پر اک بوند ٹپکی
بوند جم کر لوتھڑا
اس لوتھڑے میں ہڈیاں
پھر ہڈیوں پر ماس آیا
ماس جس پر نقش ابھرے
نقش کو جنبش ملی
اور خامشی کی کوکھ خالی ہو گئی
چیخ پہلی گفتگو تھی
تھم گئی تو اس سے پھوٹا قہقہہ
جب تھک کے ٹوٹا قہقہہ
تب آخری آواز سسکی
جنبشیں ساکت ہو گئیں
اور قبر کی خاموشیوں میں
نقش پگھلے، ماس اترا
ہڈیاں عریاں ہوئیں اور منہدم
لوتھڑا گل سڑ کے پھر سے بوند تھا
اور بوند دھرتی کھا گئی
ہائے پہلے ابتلاء کی انتہاء کیا ابتدا تک آ گئی

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 504

اس نظم میں پورا حیاتیاتی چکر (Life Circle) بیان ہوا ہے۔ انسان کی تولید، افزائش، زندگی، موت سب کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ ایک چیخ سے ہچکی تک کا سفر بیان ہوا ہے۔ بوند سے بوند تک کی یہ کہانی اس چھوٹی سی نظم میں بیان ہوئی ہے۔ اس نظم میں فلسفہ کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ زبان کیسے ارتقاء پاتی ہے اس کا حوالہ بھی موجود ہے کہ صوتیات سے کیسے لفظ جنم لیتے ہیں۔ اور حیاتیاتی چکر کیسے مکمل ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کو چند لائنوں کی نظم میں شاعر نے بخوبی بیان کیا ہے۔

کونیات (Cosmos) :

کونیات کا علم کائنات کو کھوجنے کا علم ہے۔ ستاروں، سیاروں، خلا، شہاب ثاقب اور بلیک ہول کا مطالعہ اس شعبہ طبیعات میں کیا جاتا ہے۔ جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے تو آسمان، سورج، چاند اور ستارے کسی کسی حوالے سے بطور استعارہ ہماری شاعری کا حصہ رہے ہیں۔ کچھ شعراء نے ان کی روشنی کی شاعرانہ توجیہہ (Poetic Logic) بھی پیش کی۔ مثلاً" میر صاحب کہتے ہیں:

یہ ستارے نہیں سوراخ پڑ گئے ہیں تمام
فلک حریف ہوا تھا ہماری آہوں کا
کلیات میر تقی میر

میرؔ سے اقبالؔ تک تقریباً" ہر شاعر کے ہاں آپ کو کونیات کی مثالیں مل جائیں گی۔ لیکن غالبؔ اور اقبالؔ کے ہاں کونیاتی شعور کا مظاہرہ آپ کو نظر آئے گا۔ سیّد مبارک شاہ کے ہاں کونیاتی موضوعات مکمل سائنسی شعور کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ ہم ان موضوعات کا ایک ایک کر کے جائزہ لیتے ہیں۔

فلکیات:

سیّد مبارک شاہ کے ہاں کونیاتی اشارے " جنگل گمان کے" سے ہی شروع ہو جاتے ہیں۔ جب وہ زمین و آسمان کے مروجہ روایتی استعارات کو نیات کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ مثلاً" ہماری شعری روایت میں آسمان ایک بلند تر مقام ہے اور زمین ایک پست تر جگہ ہے۔ آسمان ہمیشہ سر سے بلند ہی رہا ہے۔

جیسا کہ اقبال کہتے ہیں:

یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں
ہمت ہو پر کُشا تو حقیقت میں کچھ نہیں
بالائے سر رہا تو ہے نام اس کا آسماں
زیرِ پیر آ گیا تو یہی آسماں ، زمیں

کلیات اقبال

لیکن سیّد مبارک شاہ جانتے ہیں کہ زمین گول ہے اور یہ خلا میں معلق ہے اس لیے اس کے چاروں جانب ہی آسمان ہے۔اب ضروری نہیں کہ آسمان آپ کے سر کے اوپر ہو ، یہ آپ کے قدموں کے نیچے بھی ہو سکتا ہے۔مثلا" وہ کہتے ہیں۔

کیوں اتنی بلندی پہ سنبھل کر نہیں چلتے
افلاک پہ گر جاؤ گے دھرتی سے پھسل کے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 47

مانا کہ زمیں رہتی ہے افلاک کے نیچے
افلاک بھی پھیلے ہیں اسی خاک کے نیچے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 57

اسی طرح آسمان ہمارے ہاں اس روایتی نیلی چادر کو قرار دیتے ہیں۔ جیسے مندرجہ بالا اشعار میں اقبال نے اسے " نیلگوں فضا" قرار دیا۔ سیّد مبارک شاہ کو ادراک ہے کہ آسمان محض یہ نیلا رنگ نہیں ہے۔ ہماری آنکھوں کو جو نیلا رنگ نظر آتا ہے یہ وہ رنگ ہے جو ہماری بصارت سے پلٹتا نہیں ہے۔گویا یہ فاصلہ بھی حقیقی فاصلہ نہیں ہے جو ہماری آنکھ کی مدد سے ہمارا دماغ جان پاتا ہے۔ڈاکٹر وہاب قیصر لکھتے ہیں:

> نظر کے بارے میں ابتداء میں یہ تصور تھا کہ وہ آنکھ سے نکل کر کسی شئے پر پڑتی ہے تو وہ شئے ہمیں دکھائی دیتی ہے ۔ اسی مناسبت سے نگاہ ڈالنا، نگاہ کرم ، تیز نگاہ جیسے اور بھی بہت سے استعارے عالم وجود میں آئے ۔
>
> 14

لیکن نظریات (Optics) کا علم قدرے مختلف اصول پیش کرتا ہے۔ آسمان ہماری آنکھوں کو اس قدر محدود کیوں نظر آتا ہے اس کی وجہ ہماری آنکھوں کی حدود سے وابستہ ہے کہ یہ کس حد تک روشنی کو منعکس کر سکتی ہیں۔ سیّد مبارک شاہ کے ان اشعار سے آسمان کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پھیلا ہوا تا حدِ نظر ہے جو اندھیرا
آتا نہیں کیوں تم کو نظر دیکھنے والو
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 134

دیدنی ہے وسعت امکاں کی تنگی دیکھنا
آسماں سے آنکھ کھلتے ہی نظر ٹکرا گئی
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 194

نظروں کا یہ دھوکا بھی غنیمت ہے وگرنہ
افلاک کے اس پار بھی ایسا ہی خلا ہے
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 279

نظر ٹکرا کے واپس آ گئی ہے
فلک اتنی بلندی پر نہیں ہے
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 460

نگاہیں جس بلندی سے گری ہیں
اسی کو آسماں سمجھا گیا ہے
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 520

اک یقیں سا بن کر یوں گمان رہتا ہے
جیسے واقعی سر پر آسمان رہتا ہے
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 602

خلا

سیاروں اور ستاروں کے درمیاں خلا موجود ہے جو ان اجرام فلکی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ خلا ہی دراصل آسمان ہے جس میں ستارے، سیارے اور کہکشائیں تیر رہی ہیں۔ خلا کا وجود کتنا عظیم ہے اس سوال کا جواب اتنا ہی مشکل ہے جتنا یہ جاننا دشوار ہے کہ کائنات کتنی عظیم ہے۔ اور اب تو کائنات بھی کائناتوں میں ڈھل چکی ہے۔ خلا کے اس عظیم وجود کو سیّد مبارک شاہ یوں دیکھتے ہیں:

سدا کناروں پہ کون ہو گا

خلا کے اندر

خود اپنی گردش میں غرق و جامد

عظیم ذروں کو کیا خبر ہے

سدا تو کوئی وجود قائم نہیں رہے گا

خلا بھی دائم نہیں رہے گا

اسے بھی چھوڑو

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص290

کائناتیں

پچھلی صدی کے آخری عشرے میں عظیم ماہر کونیات سٹیفن ہاکنگ نے جب یہ تہلکہ انگیز انکشاف کیا کہ کائنات (Universe) ایک نہیں ہے بلکہ یہ کئی کائناتیں (Multi-verse) ہیں اور ہنوز بنتی چلی جارہی ہیں۔ کائنات کی اس بڑھوتری کی طرف اقبالؔ نے بھی اپنے ایک شعر میں اشارہ کیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکوں

کلیات اقبال

کائنات کی وسعت کے بارے میں ڈاکٹر وہاب قیصر اپنی کتاب "سائنس اور غالبؔ" میں رقم طراز ہیں:

> "جدید علم الافلاک کی رو سے کائنات لا متناہی ہے یا کم سے کم اتنی وسیع ہے کہ بڑی بڑی کہکشائیں اور عظیم الشان ستاروں کے جھرمٹ اس میں گم ہیں، یعنی وہ ایک دوسرے سے اتنی دور ہیں کہ اکثر کے درمیان کا فاصلہ انسان کے تصور سے بھی ماورا ہے۔ غالب کے زمانے میں یہ دریافتیں ابھی تک عدم میں تھیں، لیکن ان کے وہبی و وجدانی علم نے حسب معمول ان حقائق تک رسائی کر لی جو ابھی کسی دسترس میں نہ تھے۔" 15

سیّد مبارک شاہ کے ہاں بھی کائنات کے پھیلنے کا عمل شاعری کا موضوع بنتا ہے۔ کائنات میں فنا اور تخلیق کا عمل مسلسل جاری ہے۔ نئے ستاروں اور سیاروں کی تخلیق اور ستاروں اور سیاروں کی موت ان کی شاعری کا اہم موضوع ہے۔ وہ ایک ستارے کی شکست و ریخت اور فنا ہو جانے کی حقیقت سے واقف ہیں۔ کائنات کی وسعتوں کا اندازہ ان کی آخری کتاب کے عنوان سے لگایا جا سکتا ہے۔ سیّد مبارک شاہ کی آخری کتاب کا نام "مدار نارسائی میں" ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں وہ خود لکھتے ہیں:

> "سیارہ اپنے محور پر گھومتے ہوئے اپنے ستارے کا طواف کر رہا ہے۔ اس جبری تسلسل میں ایک لمحہ توقف اور ایک قدم انحراف کی گنجائش نہیں ہے لیکن اس قید میں رہتے ہوئے سیارہ اپنے تئیں ذرا سی ایک جنبش ایک ہلکی سے جھرجھری تو لے سکتا ہے اور یہی ارتعاش سیارے کا وہ احتجاج ہے جس سے اس کے وجود میں بھونچال آ جاتا ہے۔ زلزلے احتجاج کی سزا ہیں اور زلزلوں سے رونما ہونے والا تغیر اس جسارت کا صلہ ہے۔ یہ میرا خیال نہیں، عقیدہ ہے کہ اس صورت حال میں دماغ کا جواز فقط یہ ہے کہ کم از کم وقت میں اس کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لا کر حقیقت کے قریب تر ہونے کی کوشش کی جائے اور یہی وہ منزل ہے جو مذہب، سائنس، فلسفے اور تصوف کا مشترکہ عرفان ہے۔" 16

علم کونیات دراصل انسانی امکانات کی حدود کو چیلنج کرتا ہے۔ جیسے غالب کو دشتِ امکان ایک نقشِ پا کے برابر لگتا ہے تو وہاں یہ صرف شعری مبالغہ اور غلو نہیں ہے بلکہ کائنات کی وسعتیں واقعی اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ اب سیّد مبارک شاہ کے یہ اشعار دیکھیں:

اس عالمِ امکان سے باہر ہے جو دنیا
بستی ہے مرے گنبدِ ادراک کے نیچے
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص57

اورنگِ پائے فکر ہے چھت لامکان کی
بس اے مِرے شعور! فقط ایک اور جست
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص80

میری آنکھوں کو لگی ہے ایسی سورج کی نظر
دیکھتا ہوں کہکشاؤں کو دھواں ہوتے ہوئے
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص259

سیّد مبارک شاہ کے ہاں سورج اور روشنی کا موضوع بہت نظر آتا ہے۔ وپ جانتے ہیں کہ کائنات میں موجود تمام تر توانائی کی اقسام میں روشنی واحد ہے جس کی رفتار باقی اشیاء سے کئی گنا زیادہ ہے۔ روشنی کی یہ رفتار ہماری کائنات کی کونیات میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اسی روشنی کی موجودگی اور عدم موجودگی کو ہم دن اور رات کا نام دیتے ہیں۔ سیّد مبارک شاہ زمین اور سورج کا تعلق اپنی شاعری میں جب بیان کرتے ہیں تو وہ سورج اور زمین کی کمیت اور فاصلے کو ذہن میں رکھتے ہیں ستارے اور سیارے کی مابین فرق اور تعلق کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔ سورج زمین سے کئی گنا بڑا اور زمین کئی حوالوں سے سورج کی محتاج ہے۔

بقول ڈاکٹر وہاب قیصر:

"سورج ایک ستارہ ہے۔ وہ اپنی حرارت اور روشنی کو زمین سمیت نظام شمسی کے تمام سیاروں پر بکھیرتا رہتا ہے۔ زمین، سورج سے کئی گنا چھوٹی ہے۔ جب کہ انسان کی جسامت زمین کے مدمقابل کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور سورج کے مقابل تو اس کی وقعت شبنم کے قطرے کی سی ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ نہ صرف کمیت کی اساس پر حقیر ہے بلکہ حرارت اور روشنی کے معاملہ میں بھی۔ اس کو

توانائی اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب سورج طلوع ہو کر اپنی کرنیں اس پر نچھاور نہ کر دے۔ شبنم کا قطرہ کسی مقام پر ساکت رہتا ہے۔ اس کو متحرک رہنے کے لئے فضاء میں واپس جانا پڑے گا، جہاں پر وہ سرد ہو کر شبنم کی شکل اختیار کر لیا تھا۔"17

سیّد مبارک شاہ کے ہاں سورج نظام شمسی لا سربراہ ہے۔ اس لیے وہ اس پورے نظام پر ایک سربراہ کی حیثیت سے راج کرتا ہے۔

بقول شاعر

کیا نارسائی شرط ہے خواہش کے واسطے
سورج کی گردشیں کہ تعاقب ہیں رات کا

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص45

سورج نڈھال ہو کے جو ہونے لگا غروب
تھک کر ہوا زمین پر ہوا سایہ مرا دراز

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص51

قربِ زمیں کی آنچ کو محسوس تو کرے
سورج خلا میں پھینک دے شعلے اتار کے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص276

سیّد مبارک شاہ کے ہاں سورج طاقت کی حتمی علامت نہیں ہے۔ بلکہ وہ سورج کو ایک پڑاؤ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں اگر زمین اور چاند سمیت کچھ سیاروں اور سیارچوں کو سورج کی روشنی درکار ہے تو یقیناً" سورج کو بھی کسی کی روشنی درکار ہو گی۔

بقول ڈاکٹر وہاب قیصر:

"یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کوئی قوت خود بخود عمل پیرا نہیں ہوتی جب تک کہ اس کے پس پردہ کوئی توانائی یا توانائی رکھنے والی کوئی شے نہ ہو۔ کوئی شے سے مراد چھوٹے سے چھوٹا ذرہ یا بڑے سے بڑا کوئی ستارہ ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ پوری کائنات بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔"18

بقول غالبؔ:

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے
دیوان غالب

سیّد مبارک شاہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

گر روشنی مہتاب کو خورشید نے دی ہے
پر تو ہے کسی اور کا سورج کی ضیا بھی
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 192

سیّد مبارک شاہ کے ہاں سورج اور اس سے آگے کی کائنات تک رسائی کی خواہش بھی پائی جاتی ہے۔

آفاق سے پرے ہے مری آگہی کی لو
سورج کا دیکھتا ہوں میں سایہ زمین پر
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 129

سورج ہمارے ہاں روشنی کا استعارہ ہے۔ یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ سورج طلوع ہوتے ہی آسمان پر نظر آنے والے ستارے اور سیارے نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ سیّد مبارک شاہ اس کو نیاتی حقیقت کو نئے زاویے سے دیکھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سورج کی روشنی ہماری آنکھوں کو بینائی فراہم نہیں کرتی بلکہ ہمیں اندھا کر دیتی ہے۔ ہم کائنات کی وسعتوں تک نہیں دیکھ پاتے۔ روشنی ہماری بصارت کو وسیع نہیں کرتی بلکہ محدود کر دیتی ہے۔ یہ ایک عام مشاہدہ ہے جب ہم رات کو گاڑی چلاتے ہوئے کسی ایسی گاڑی کو کراس کریں جو ہیڈ لائٹس آن کیے ہوئے ہو تو ایک لمحے کے لیے آپ سامنے کا منظر نہیں دیکھ پاتے۔ اس بات کو سیّد مبارک شاہ نے یوں بیان کیا ہے۔

کتنے نادیدہ جہانوں پہ نظر پڑتی ہے
تیرگی حدِ بصارت کو فنا کرتی ہے
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 351

یہ کیسی تیرگی سورج سے پھوٹی
کہ سب روشن ستارے کھو گئے ہیں

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 344

ستارے روشنی میں بجھ گئے ہیں
مری آنکھوں سے کیا دھوکا ہوا ہے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 297

نظر میں کوئی تارہ ہے نہ جگنو
ہمیں سورج نے اندھا کر دیا ہے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 294

سیّد مبارک شاہ کو نباتی شعور رکھتے ہیں اس لیے جانتے ہیں کائنات میں موجود کوئی شے ابدیت کی حامل نہیں ہے۔ ہر شے کی ایک متعین عمر ہے۔ ستارے اور سیارے بھی اسی فنا و بقا کی جنگ میں برابر کے شریک ہیں۔ ان کی عمر بھلے کروڑوں سال پر مشتمل ہو لیکن یہ فنا کے اس مرحلے سے ضرور گزرتے ہیں۔ سیّد مبارک شاہ چشمِ تصور سے سورج کے فنا ہو جانے کے بعد کا منظر بھی اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں۔

بس اک جھونکے سے سورج مثلِ برگِ بے شجر ہو گا
وہ دن جب ان خلاؤں سے ہواؤں کا گزر گیا

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 231

مکافات

پھر ہواؤں کی ٹھوکر سے پربت اٹھے

اور صحرا خلاؤں کے ہاتھ آ گئے

گل ہوا آفتاب اور تارے بجھے

کہکشائیں اندھیرے میں ٹکرا گئیں

بے بصر آندھیاں جب بھٹکنے لگیں

سایہ سدرۃ المنتہیٰ جھڑ گیا

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص425

بلیک ہول:

روزنِ سیاہ یا بلیک ہول ایک نئی دریافت ہے۔ سائنس دان اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ایک روزنِ سیاہ کس قدر بڑا اور طاقت ور ہو سکتا ہے۔ تاحال ماہر علوم کونیات اسے نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پوری کی پوری کہکشائیں اس میں سما سکتی ہیں۔ یہ ایک بہت عظیم وجود ہے جو بے پناہ توانائی اور کشش ثقل رکھتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر وہاب قیصر کہتے ہیں:

> "کائنات میں تمام ستارے روشنی اور حرارت خارج کرتے رہتے ہیں۔ ان میں یہ توانائی نیوکلیر اتصال (Fusion) سے پیدا ہوتی ہے، جس کے دوران ہائیڈروجن گیس، ہیلم گیس میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ ستاروں کی پیدائش کے لاکھوں کروڑوں سال بعد وہ ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں، جس میں ان کی تمام ہائیڈروجن گیس ختم ہو جاتی ہے اور نیوکلیر اتصال کا عمل رک جاتا ہے۔ توانائی کی پیداوار کا ذریعہ نا ہونے کی وجہ سے ستارے اپنی تباہی کی طرف گامزن ہوتے ہیں اور وہ ایک دھماکے کے ساتھ Super Nova میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ بعد میں "سوپر نووا" بھی تباہ ہو کر یا تو "نیوٹران اسٹار" کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، یا پھر روزنِ سیاہ(Black Hole)بن جاتے ہیں۔ مستقبل میں تمام ستاروں کی طرح سورج بھی ایسی صورت حال سے دوچار ہونے والا ہے۔ جب سورج ہی باقی نہیں رہے گا تو زمین سمیت نظام شمسی کے تمام سیارے اور چاند ادھر ادھر بکھر جائیں گے اور ایک دوسرے سے ٹکرا کر تباہ ہو جائیں گے۔"19

گویا یہ اتنا عظیم وجود ہے کہ کئی ستارے بھی اس میں فنا ہو سکتے ہیں۔ سیّد مبارک شاہ کائنات کے فنا ہو جانے کا منظر اکثر اس بلیک ہول میں ہماری زمین اور نظام شمسی کے فنا ہونے کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ ان کے ہاں بلیک ہول کا تذکرہ فنا کا تذکرہ ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

رات ڈھلتے ہی یہ کیسی تیرگی سی چھا گئی
اے اندھیری روشنی تو کہکشاں کو کھا گئی

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 194

بھرے اجالوں سے دور کالا شگاف کس کو بلا رہا ہے
نہ اس کو میرا بدن بھرے گا نہ اس تیرا بدن بھرے گا

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 407

زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے
حدودِ عالم میں سارا عالم بدل گیا ہے
ابھی ابھی جو خلا کے دامن میں
جھلملاتی تھیں کہکشائیں
وہ راکھ بن کر سیاہ وسعت میں جھڑ چکی ہیں

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 380

زمان و مکاں

انسان نظام شمسی کے ایک سیارے زمین پر آباد ہے۔ ہمارے ہاں وقت اور فاصلے کا تصور سورج اور اس زمین کے تعلق سے جڑا ہوا ہے۔ انسان ہمیشہ سے ہی زمان و مکان کے سلاسل کو توڑنا چاہتا ہے۔ تیز ترین ذرائع مواصلات سے سپر کمپیوٹر تک اسی خواہش کی تکمیل کے لیے انسان پہنچا ہے۔ بقول ڈاکٹر وہاب قیصر:

"جب سے انسان نے حیات و کائنات پر غور کرنا شروع کیا کہ ہستی کی اصل کیا ہے۔ اس زمانے سے آج تک سب سے زیادہ اہم مشکل اور نا قابل حل مسئلہ یہ رہا ہے کہ وقت یا زمان کیا ہے۔ اگرچہ اس سے مکان کا مسئلہ بھی وابستہ رہا لیکن زمان کی ماہیت کا جاننا اس سے زیادہ اہم سمجھا گیا۔ زمان کیا ہے۔ کیا اس کی کوئی ابتدا یا

انتہا ہو سکتی ہے۔ تمام واقعات کو ماضی ، حال اور مستقبل میں تقسیم کرتا ہے۔ مگر
خود کوئی وجود یا واقعہ نہیں بنتا۔" 20

آئن سٹائن نے نظریہ اضافت پیش کیا تو پوری دنیا میں زمان و مکان کی حدود کی بحث چھڑ گئی۔ آئن سٹائن کے مطابق روشنی کی رفتار سے اگر کوئی مادہ سفر کرے تو وہ وقت کی گردش روک سکتا ہے۔ سورج کی روشنی 8 منٹ میں زمین پر پرتی ہے۔یعنی اگر سورج اسی لمحے فنا ہو جائے تو اگلے 8 منٹ تک ہم اس کی روشنی میں رہیں گے۔ ہمارے لیے سورج 8 منٹ بعد فنا ہو گا۔کائنات میں کئی ستارے ایسے ہیں جن کی روشنی زمین تک پہنچنے میں کئی سال لیتی ہے۔یہ عین ممکن ہے کہ ہم جس ستارے کو آسمان پر دیکھ رہے ہوں وہ پانچ دس سال پہلے فنا ہو چکا ہو۔اس مضمون کو سیّد مبارک شاہ یوں بیان کرتے ہیں۔

قیاس

کسے خبر ہے
کہ اپنی آنکھوں میں بسنے والے
نہ جانے کتنے ہی ننھے منے جسیم تارے
ہماری نظروں سے نوری مدت کی دوریوں پر
اجڑ گئے ہیں
کسی نے دیکھا
نگاہ جن پر جمی ہوئی ہے
انھیں کے پاؤں
خلا کے فرشِ بقا سے کب کے اکھڑ گئے ہیں

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 271

اک لازماں مکان کی کھڑکی کی گھات سے
ماضی میں دیکھتا ہے وہ فردا کے حال کو
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص461

زمان و مکاں کی بحث نے انسان کو خلا میں سفر کرنے کی ہمت دی ہے۔اس وقت انسان دوسری دنیاؤں کی تلاش میں مریخ اور اس سے آگے جانے کی تیاری کر چکا ہے۔وہ وقت دور نہیں جب انسانی آبادی کسی اور سیارے پر بھی موجود ہو گی۔بقول ڈاکٹر محمد نوید:

" علوم فلکیات میں انسان نئے سنگ میل عبور کرنے جا رہا ہے۔مریخ پر آباد ہونے کا خواب تعبیر ہونے کا وقت بہت قریب ہے۔نئے سیاروں کی دریافت اور نظریہ اضافت کی نئی جہتیں تلاش کرنے کا عمل جاری ہے۔ایسا لگتا ہے انسان کا مستقبل بہت جلد مکمل تبدیل ہونے والا ہے۔"21

سیّد مبارک شاہ کے ہاں بھی یہ تلاش کا عمل جاری رہتا ہے۔

نظارہ نجوم پسِ نارِ آفتاب
اتنا ہی نا گزیر ہے جتنا محال ہے
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص487

رہتا ہے وہ اوقات و مقامات سے آگے
جانا ہے مجھے مرکزِ میقات سے آگے
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص424

حوالہ جات

1۔ ماکلی،شاہد،جدید سائنس اور جدید شاعری کی مشترکہ جمالیات،ماہنامہ ادب لطیف، جلد 85، شمارہ9، ستمبر 2020،مدیر اعلیٰ حسین مجروح،لاہور،ص 185-186

2۔ محمد نوید، برگیڈیئر ڈاکٹر، انٹرویو از راقم، بمقام شعبہ فزکس ،برن ہال ،ایبٹ آباد، بدھ 5 اگست 2020،

3۔ نارنگ،گوپی چند،حرف چند،، غالب اور سائنس،ڈاکٹر وہاب قیصر،سائنس اویرنس اینڈ پروموشن ٹرسٹ،حیدر آباد،ہندوستان،سن اشاعت 2000ء، ص8

4۔ یم یم تقی خاں، پروفیسر،غالب کا وجدانی ادراک، غالب اور سائنس،ڈاکٹر وہاب قیصر،سائنس اویرنس اینڈ پروموشن ٹرسٹ،حیدر آباد،ہندوستان،سن اشاعت 2000ء، ص8

5۔ ماکلی،شاہد، جدید سائنس اور جدید شاعری کی مشترکہ جمالیات، ماہنامہ ادب لطیف، جلد 85 شمارہ9، ستمبر 2020،مدیر اعلیٰ حسین مجروح،لاہور،ص 184

6۔ وہاب قیصر،ڈاکٹر، غالب اور سائنس،سائنس اویرنس اینڈ پروموشن ٹرسٹ،حیدر آباد،ہندوستان،سن اشاعت 2000ء، ص15

7۔ ماکلی،شاہد،مجید امجد کی شاعری میں کونیاتی اور سائنسی وژن، غیر مطبوعہ،2021

8۔ ماکلی،شاہد،جدید سائنس اور جدید شاعری کی مشترکہ جمالایت،ماہنامہ ادب لطیف، جلد 85، شمارہ9، ستمبر 2020،مدیر اعلیٰ حسین مجروح،لاہور،ص 184

9۔ ماکلی،شاہد، جدید سائنس اور جدید شاعری کی مشترکہ جمالیات،ماہنامہ ادب لطیف، جلد 85 ، شمارہ9، ستمبر 2020،مدیر اعلیٰ حسین مجروح،لاہور،ص 187

10۔ سلطان ناصر ،تیسرے جہان کی تلاش،کلیات سیّد مبارک شاہ،جہلم بک کارنر،جہلم،2017،ص 18

11۔ ماکلی،شاہد، جدید سائنس اور جدید شاعری کی مشترکہ جمالیات ،ماہنامہ ادب لطیف، جلد 85، شمارہ9، ستمبر 2020،مدیر اعلیٰ حسین مجروح،لاہور،ص 186

12۔ محمد ارشد،مدارِ نارسائی میں (سیّد مبارک شاہ)کا تجزیاتی مطالعہ ،مقالہ ایم اے اردو ،مملوکہ گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج، بہاول پور،2012ء،ص 44

13۔ مبارک شاہ، سیّد،برگد کی دھوپ میں، سروش پبلی کیشنز، فیصل آباد،2000ء، ص 239

14۔ وہاب قیصر،ڈاکٹر،غالب اور سائنس،سائنس اویرنس اینڈ پروموشن ٹرسٹ،حیدر آباد،ہندوستان،سن اشاعت 2000ء،ص58

15۔ ایضاً،ص100

16۔ مبارک شاہ،سیّد،کلیات سیّد مبارک شاہ،جہلم بک کارنر،جہلم،2017،ص 365

17۔ وہاب قیصر،ڈاکٹر،غالب اور سائنس،سائنس اویرنس اینڈ پروموشن ٹرسٹ،حیدر آباد ہندوستان،سن اشاعت 2000ء،ص68

18۔ ایضاً،ص77

19۔ ایضاً، ص37

20۔ ایضاً، ص113

21۔ محمد نوید، بر گیڈیئر ڈاکٹر، انٹرویواز راقم، بمقام شعبہ فزکس، برن ہال، ایبٹ آباد، بدھ، 5 اگست 2020ء

باب چہارم

سیّد مبارک شاہ کی شاعری میں سماجی شعور

سماجی شعور

"سماج" اردو لغت میں پایا جانے والا ایسا لفظ ہے جو مقامی زبانوں سے اردو میں دخیل ہوا۔ یہ سنسکرت / ہندی زبان کا لفظ ہے۔ نور الحسن نیر کاکوروی (1865-1936) اپنی تالیف "نور اللغات" میں اسے سنسکرت زبان سے ماخوذ اور صیغے کے اعتبار سے مونث قرار دیتے ہیں اور اس کے معانی "سبھا اور انجمن" کرتے ہیں۔(1) جبکہ اسی کے مترادف لفظ جو اردو میں عربی سے آیا وہ معاشرہ ہے۔ معاشرہ کا سہ حرفی مادہ ع۔ش۔ر۔ ہے۔ "فرہنگِ آصفیہ" میں سیّد احمد دہلوی نے معاشرہ کو تو اپنی لغات میں شامل نہیں کیا لیکن معاش اور معاشرت کو لائے ہیں۔ معاش عربی اسم مونث ہے جو "روزی، خوراک، رزق، بسر اوقات، گزران، اوقات بسری، گزر اوقات، وہ شے جس سے زندگی کی جاتی ہے"۔ (2)۔ دوسرا لفظ جس میں معاشرے کے مادے سے معاشرت کو سیّد احمد دہلوی (1846-1918) بیان کرتے ہیں وہ معاشرت ہے۔ یہ بھی اسم مونث ہے جو "آپس میں مل کر زندگانی کرنے، کسی کے ہمراہ عیش کرنے اور اوقات بسری" کے معنی کا حامل ہے۔3 نور الحسن نیر بھی "نور اللغات" میں معاشرہ کے بجائے انھی دو لفظوں کو قریب قریب معنوں میں بیان کرتے ہیں۔ نور اللغات میں بھی معاشرہ کا لفظ فرہنگِ آصفیہ کی طرح اپنی وضاحت سے محروم رہا۔4

معاشرے کے بارے میں عرب زبان و ادب میں ایسا گراں قدر کام ہوا کہ ابو زید عبدالرحمٰن بن محمد بن ابنِ خلدون (1332-1406) کی کتاب بلکہ صرف کتاب کے مقدمے (مقدمہ فی التاریخ المعروف مقدمہ ابن خلدون) کو ہی معاشروں کے وقوع و قیام اور ان میں تہذیبی و تمدنی زندگی کے مطالعے کی بنیادی کتب قرار دیا گیا اور ابنِ خلدون کو "بابائے عمرانیات" کے لقب سے ملقب کیا گیا۔

سنسکرت لفظ "سماج" کا متبادل عربی لفظ جو اردو میں مروج ہے وہ "معاشرہ" ہے اور انگریزی میں اس کے لیے "Society" سوسائٹی کا لفظ مروج ہے۔ ایلگن۔ ایف۔ ہینٹ نے معاشرے کے مطالعے سے متعلق اپنی کتاب میں اس کی وضاحت یوں کی ہے:

> "The scientific study of social, cultural, psychological, economic and political forces that guide individuals in their actions is called as social science."5

"افراد کو انفرادی اعمال میں رہنمائی کرنے والی سماجی، ثقافتی، نفسیاتی، معاشی اور سیاسی طاقتوں کا سائنسی مطالعہ سماجی سائنس کہلاتا ہے۔" (ترجمہ: راقم)

رالف لنٹن کی تعریف کو سماجی سائنس کے طالب علم اس علم کو سمجھنے میں بہت معاون پاتے ہیں۔ وہ معاشرے کی وضاحت کرتے ہوئے اسے مسلم دانش وروں سے قریب تر لاتا ہے:

افراد کا ایسا گروہ معاشرہ بن جاتا ہے جو طویل عرصہ ایک جگہ رہ رہا ہو اور اشتراکِ عمل کی وجہ سے اس حد تک منظم ہو جائے کہ تمام لوگ اپنے آپ کو ایک جسم کے مانند محسوس کریں۔(6)

پروفیسر پیٹرک نے بھی اسے زندگی اور شہری زندگی کے مسائل سے وابستہ قرار دیا ہے:

"Civics is a science dealing only with life and problems of cities."

"سماجیات کا مطالعہ ایک سائنس ہے جو زندگی اور شہری زندگی کے مسائل سے تعلق رکھتی ہے۔"(7)

بابائے عمرانیات اور سماجی علوم کے سائنسی مطالعے کے بانی ابنِ خلدون نے معاشرے یا سماج کو حیوانی جسم سے تشبیہ دی ہے اور قوموں کے عروج و زوال کے ابدی اصول وضع کیے ہیں۔8

جب مشرق میں مغربی نو آباد کاروں نے اپنے استحصالی پنجے گاڑے اور سامراجیت کے ہتھکنڈے اپنائے تو مشرقی مسلم ممالک میں بین الاسلامیت کی تحریک اٹھی اور اس حوالے سے مسلم مفکرین نے غور و خوض کا آغاز کیا جس میں سے ایک اہم آدمی سیّد جمال الدین افغانی تھے۔

ان کی فکر میں بھی سماجی مطالعے کی جہات ملتی ہیں:

انسان کو اشرف المخلوقات پیدا کیا گیا، اسے ترقی یافتہ زندگی بسر کرنے کا شعور عطا کیا ہے اور یہ زندگی اجتماعی شکل اختیار کرتی ہے۔ ان سب کے اجتماع کا نام معاشرہ ہے اور معاشرہ ایک جسم کے مانند ہے۔(9)

مغربی اور مشرقی مفکرین کے افکار میں اہم چیز معاشرے کا ایک جسم کی طرح ہونا ہے خواہ وہ کسی بھی مذہب یا مختلف مذاہب سے تعلق رکھتا ہو۔ زندگی جب اختلافِ عمل کا نام ہے تو جسم کے اعضا

کی طرح فرد یا افراد کے چھوٹے بڑے گروہ بھی مختلف اعمال و افعال کی انجام دہی سے اپنی شناخت بناتے ہیں۔

> تاریخ کے ابتدائی زمانوں میں تقریبا ہر جگہ ہم سماج کو مختلف پرتوں میں تہہ بہ تہہ پاتے ہیں۔ مختلف سماجی مراتب کا ایک پورا زینہ ملتا ہے۔ قدیم روم میں ہمیں پتریشین، نائٹ، پلے بین ، اور غلام ملتے ہیں اور عہد وسطی میں جاگیردار، آسامی، استاد، کاریگر، نوسکھئے ،شاگرد اور زرعی غلام ۔ اور تقریبا ان تمام طبقوں میں مزید ذیلی تقسیم ہیں۔(10)

اردو شاعری کو گل و بلبل تک محدود ہونے کے طعنے دیے جاتے ہیں۔ اس ایک بات سے اردو شاعری کی جمالیاتی روایت کی تہہ میں موجود اس شعور کی نفی کر دی جاتی ہے جس کے ذریعے سے ان روایتی تلازمات کے ساتھ انسان، کائنات اور خدا کے تمام معاملات کی بات بھی جاتی ہے ۔جسے ہر چند مشاہدۂ حق کی گفتگو ہی کیوں نہ ہو بادہ و ساغر کہے بغیر بات نہیں بنتی کی دلیل کے ساتھ واضح کیا جاتا ہے۔اردو شاعری کی روایت میں ولی دکنی کے دہلی میں آنے سے پہلے ہی یہاں جعفر زٹلی کے دیوان نے ایک حشر برپا کیا ہوا تھا۔ اس کلام کو زٹلیات کہہ کے اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش بھی ہوئی لیکن اس کلام نے جو اثرات مرتب کیے اسی کی بھینٹ خود جعفر زٹلی بھی چڑھ گئے۔ یہ نظمیں اور ہجو نگاری معاشرے پر اثر انداز ہونے والے سب سے بڑے طبقے یعنی بادشاہ اور اس کے متعلقین شہزادے، شہزادیاں، وزرا اور سرداروں کی اخلاقی گراوٹ اور پستی کو اسی انداز میں پیش کر رہے تھیں جو اس کی حقیقی تصویر تھی۔ سماجی حقیقت نگاری کے اس رویے کو اردو شاعری کے آغاز سے ہی کارفرما ہونے کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے اس کلام کے مرتب رشید حسن خاں اپنا تجزیہ پیش کرتے ہیں:

> "جعفر کا دیوان ولی کے دہلی آنے سے برسوں پہلے مرتب کیا جا چکا تھا۔ جعفر کے کلیات میں ایک بھی غزل نہیں۔ اس طرح یہ بات مسلم ہو جاتی ہے کہ دہلی میں اردو کی شعری روایت کی بنیاد رکھنے والوں میں جعفر کو اولیت حاصل ہے اور یہ بھی کہ دہلی میں اردو شاعری کا آغاز غزل گوئی سے نہیں سماجی حقیقت نگاری سے معمور شاعری سے ہوا جو سرتاسر نظموں پر مشتمل ہے۔"11

نظم میں سماجی حقیقت نگاری کے آنے سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ غزل کے مزاج میں اپنے سماج سے تعلق کی بات نہیں پائی جاتی بلکہ اردو غزل میں سماجی شعور اور طبقاتی کشمکش کی بحث ہمارے سماج میں ادیبوں، تنقید نگاروں اور محققین کے اندر دو طبقات کو جنم دے دیتی ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جو غزل کو" شاہی مزاج کی آئینہ دار اور بادشاہی کی پروردہ سمجھ کے اس میں شاہی مفادات کے تحفظ کا راستہ جانتے ہیں۔"(12) ان کے نزدیک غزل کی صنف کی ترویج شاہی دربار کے زیر اثر ہوئی تھی اسی لیے ہندوستان کے مقامی عناصر درباری تعصبات کے باعث اُردو غزل میں جگہ نہ بنا سکے۔

دوسرے گروہ کے نزدیک غزل قصیدے کے ردِ عمل میں ایک ایسی الگ صنف کے وجود کی دلیل ہے جس نے قصیدے کے محبوب کی خوبیوں کو محبوب میں سمو کر اسے گلہ گزاری اور شکوے کے ذریعے سے اپنے منصب کے تقاضے پورے کرنے کی راہ دکھائی۔ ان کے مطابق "وہ حقائق جو قصیدہ گو شاعر کے ضمیر کو کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے ان کے اظہار کے لئے غزل وجود میں آئی۔ "13

قصیدے کے شاعر نے اپنے قصائد کے پہلے حصے یعنی تشبیب میں جس طرح کی غزل کی بنیاد رکھی اور جس شاعر کا تصور پیش کیا وہ غزل میں آ کے ایک الگ عاشق کا روپ بن گیا اور قصیدے سے الگ غزل کے وجود میں جو شاعر کا تصور ہے وہ قصیدے سے الگ ہے اور محبوب کی خوشامد اس کے پیشِ نظر نہیں ہے بلکہ وہ اسے مسلسل اپنے رویے بدلنے کی بات کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یوں غزل جس نے قصیدے سے جنم لیا اس کی تشکیل کے سلسلے میں غزنوی دور کے عظیم شاعر حکیم سنائی (1080ء-1131ء) کا ذکر کیا جاتا ہے۔ دائرہ معارفِ اسلامیہ میں حکیم سنائی کے غزل کو قصیدے سے الگ کر کے اس میں تشبیب سے دیگر صورت در آنے کا ذکر یوں آیا ہے:

> دربارِ غزنی کے مشہور شعرا فردوسی، عنصری، اسدی، فرخی، منوچہری اور حکیم سنائی تھے۔ فردوسی کو چھوڑ کر سب نے غزلیں کہیں لیکن یہ غزلیں بھی ماسوا سنائی کی غزلوں کے تشبیب ہی کی صورت میں تھیں۔ سنائی کی غزلیات سے پہلے جداگانہ غزل کا کہیں پتہ نہیں چلتا، اس لیے یہی کہا جائے گا کہ قصیدے سے الگ غزلیں لکھنے والوں میں سنائی کو تقدم حاصل ہوا۔14

حکیم ابو المجد مجدود آدم سنائی نے جوانی ہی میں غزنوی حکمرانوں کے شاہی دربار سے وابستہ

ہو کے شاہان کے کئی قصیدے لکھے ۔ شاہی دربار سے وابستگی نے انھیں لہو و لعب اور مدح و ستائش کی طرف راغب کیا لیکن ان کی زندگی بدل دینے والا ایسا واقعہ ہوا جس نے سنائی کی زندگی بدل کے رکھ دی۔ اس تبدیلی نے بعد میں آنے والے فارسی ہی نہیں بلکہ اردو ادب پر بھی دور رس اثرات مرتب کیے۔

ڈاکٹر عبد الحسین زریں کوب نے اپنے تذکرے "تذکرہ دولت شاہ" میں "درد آشام دیوانے کی حکایت" میں حکیم سنائی کی زندگی میں تصوف اور عرفان کی طرف آنے کو بیان کیا ہے۔ حکایت میں اول غزنی کے مجذوب درد آشام کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ غزنی کے مے خانوں میں گھوم کر شراب کی تلچھٹ اکٹھی کرتا تھا اور کسی حمام کے آتش خانے میں اس کا قیام تھا جہاں وہ یہ شراب پیتا۔ ایک بار سنائی کا گزر وہاں سے ہوا تو اس نے درد آشام دیوانے کا اپنے دوست سے مکالمہ سنا جس میں وہ پہلا جام ابراہیم غزنوی کی یاد میں نوش کرتا ہے کہ لوگ تو اسے عادل بادشاہ کہتے ہیں لیکن وہ بد خصلت اور کور چشم ہے اس کی تنگ نظری نے یہ حال کیا ہے کہ وہ غزنی کی حفاظت تو کر نہیں سکتا لیکن دوسرے علاقوں پر قبضہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ پھر وہ اپنے دوست سے ایک اور جام کا مطالبہ یوں کرتا ہے:

> ایک جام اور دو تا کہ کور چشم شاعر سنائی کے نام نوش جاں کروں۔ اس کے دوست نے پھر کہا: سنائی ایک بذلہ سنج شاعر ہے اور خاص و عام میں مقبول ہے۔ اس کے متعلق تجھے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے درد آشام نے کہا تمہارا خیال غلط ہے۔ وہ تو ایک احمق آدمی ہے جس نے بے سروپا اور لایعنی باتوں کو آپس میں جوڑ کر شعر کا نام دے رکھا ہے اور ہر روز ایک حریص و طماع اور احمق آدمی کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر شعر پڑھتا ہے اور اس کی جھوٹی تعریفوں کے پل باندھتا ہے۔ اسے اتنا بھی شعور نہیں کہ وہ اس قسم کی شاعری اور بے ہودہ باتوں کے لیے پیدا نہیں ہوا۔ درد آشام کی ان باتوں نے شاعر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا جو اس وقت ایک نیا قصیدہ بادشاہ کے حضور لے جا رہا تھا۔ چنانچہ وہ مخلوق خدا سے منہ موڑ کر خالق کا ہو گیا۔15

حکیم سنائی کے اس ذہنی انقلاب نے اسے نہ صرف دربار سے اور بادشاہ کی تعریف سے برگشتہ کیا بلکہ وہ غزل جو کبھی تشبیب یا نسیب کا حصہ تھی اور اس میں شاہوں کی مدح سرائی عام تھی اس میں

ہی پسے ہوئے طبقے کے احوال کو بیان کرنے اور انسان دوستی کی سنائی نے وہ بنیاد رکھی کہ انھیں پھر نہ صرف مولانا روم نے اپنی مثنوی میں بلکہ اقبال نے بھی ضربِ کلیم اور بالِ جبریل میں زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا۔ غزل کے پہلے شاعر نے ہی جن امکانات کی بنیاد رکھی مستقبل میں وہ فارسی اور اردو ادبیات میں مستقل استعاروں کی حیثیت میں فروغ پانے لگے جس کی طرف اقبال اشارہ کرتے ہیں:

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی
مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ، وہی آش
حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر
اک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش
ضربِ کلیم

نظم "اقبال" کے یہ اشعار بھی مشرق و مغرب میں انسان کی بیداری کا سرنامہ ہیں۔ اقبال کے ہاں بھی حسین بن منصور حلاج کی طرح بیت المال کے دروازے عوام کے لیے کھول دینے کا پیغام ملتا ہے۔ دہقانوں کو جس کھیت سے روزی میسر نہ ہو اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلانے میں وہ رازِ خودی ہے جس کی پاداش میں حلاج کو بھی سولی چڑھنا پڑا اور یہی سبق اقبال کو رومی کے ذریعے سے سنائی سنا رہے ہیں۔ یوں غزل میں محکوم طبقے کی نمائندگی کے معمار کو اقبال نہ صرف خراجِ عقیدت پیش کر رہے ہیں بلکہ ان کے ادبی اور شعری مزاج میں پائی جانے والی انسان دوستی اور پسے ہوئے طبقے کی حمایت کو بھی سامنے لاتے ہیں۔

اردو جس خطے میں پروان چڑھی اور اپنے عروج کو دیکھا وہاں بھی اس کے مزاج آشناؤں نے اسے دو دبستانوں میں تقسیم کیا۔ نو آبادیاتی عہد میں اس کے دونوں مراکز سے شعوری طور پر اس کا رخ لاہور / پنجاب کی طرف موڑ دیا گیا۔ اردو ہندی تنازعے ہوں یا اردو کی بنیاد پر مسلمانوں میں قومیت کے احیا کی تحریکیں ان سب نے ایک ایسے مزاج کو تشکیل دیا جس نے اردو شاعری اور خاص طور پر غزل میں بھی نئی شناختوں کو جنم دیا۔ پاکستان کا قیام اسی اردو بولنے والے خطے کے دو بڑے طبقات میں تقسیم ہو جانے کا عملی اظہار تھا۔ یہ عملی اظہار نہ صرف سیاسی اور سماجی حوالے سے وقوع

پذیر ہوا بلکہ ادبی حوالے سے اس کی بنیادیں ڈاکٹر لائٹنر اور انجمن پنجاب کے ذریعے سے رکھ دی گئی تھیں بلکہ اس سے کہیں پہلے فورٹ ولیم کالج کے ذریعے سے ہی رسم الخط اور مقامی و غیر ملکی زبانوں کے الفاظ کے ردو قبول کے اصول متعارف کروا کے اور ان کی سیاسی مصلحت کے ذریعے پاس داری کروا کے بھی اس کی بنیادیں رکھی جا چکی تھیں۔

پاکستان کے قیام نے دلی اور لکھنو کے دبستانوں سے لاہور کا رخ کرنے والے نو آبادیاتی محرکات میں وہ حتمی تبدیلی کی جس نے نئے شعری دبستانوں کی بنیاد بھی رکھی ۔ اردو جاننے اور لکھنے والے خطے میں سرحدوں کی خلیج نے ادبی اور لسانی حوالے سے بھی خلیج کو وسیع کیا۔ ہندوستان میں رہ جانے والے اردو دان طبقے نے پاکستان اور اس کی طرف ہجرت کر جانے والے اصحاب کو جس نظر سے دیکھا اس کے لیے مدینے سے کوفے کی طرف ہجرت کر جانے کی تلمیح کو بطور استعارہ اتنی کثرت سے استعمال کیا گیا کہ یہ ایک مستقل استعارے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ عرفان صدیقی (1939ء۔2004ء)کا نام اس حوالے سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے جن کے بڑے بھائی نیاز بدایونی ہجرت کر کے پاکستان میں کراچی آ بسے تھے۔ عرفان صدیقی ہندوستان میں ہی اپنے خاندان کے ہمراہ رہے اور مقابلے کا امتحان پاس کر کے سول سروس میں ملازمت کرتے رہے۔ عرفان صدیقی کی شاعری کو پاکستان میں ہجرت کر کے آنے والے اردو دان طبقے سے ایک مسلسل مکالمے کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے بھائی اور شاعر نیاز بدایونی کو مخاطب کر کے اپنی مشہور غزل میں کہتے ہیں:

میں ایک دن دشت میں چھوڑ کر چل دیے تھے تمھیں کیا خبر یا اخی
کتنے موسم لگے ہیں ہمارے بدن پر نکلنے میں یہ بال و پر یا اخی
نہر اس شہر کی بھی بہت مہرباں ہے مگر اپنا رہوار مت روکنا
ہجرتوں کے مقدر میں باقی نہیں اب کوئی قریہ معتبر یا اخی
یہ بھی اچھا ہوا تم اس آشوب سے اپنے سر سبز بازو بچا لے گئے
یوں بھی کوئے زیاں میں لگانا ہی تھا ہم کو اپنے لہو کا شجر یا اخی

کلیات: دریا

عرفان صدیقی کی طرف سے رقم کیے جانے والا یہ استغاثہ دو ممالک اور ان میں پائے جانے والے اشتراکات اور اختلافات کی کلید ہے۔ اپنے خوابوں کی سرزمین کی طرف ہجرت کرنے والے لوگ پیچھے رہ جانے والوں کے لیے کیسے کیسے پچھتاوے اور یادیں چھوڑ جاتے ہیں وہ ان اشعار میں ہی نہیں بلکہ اس پوری غزل اور عرفان صدیقی کے ساتھ ساتھ اس موضوع پر لکھنے والے ہندوستانی شعرا کے ہاں اپنا مسلسل اظہار پاتی ہے۔ دوسری طرف پاکستان میں ہجرت کرکے آنے والے اصحاب اور یہاں موجود مقامی اردو شناس طبقے نے ادب و فن میں جن رویوں کو اپنایا ان کا مطالعہ بھی اپنی جگہ ایک الگ مقالے کا متقاضی ہے۔ ہمارے موضوع سے مطابقت رکھنے والے رویوں پر توجہ کو مرکوز کیا جائے تو دیکھا جا سکتا ہے کہ اردو میں لکھنے والے دو گروہ پاکستان میں وجود میں آئے۔ ایک تو وہ جو پہلے سے یہاں موجود تھے اور سندھی، پنجابی، بلوچی اور پشتو یا دیگر زبانوں اور خطوں سے ان کا تعلق تھا۔ دوسرے وہ جو دلی، لکھنو، بدایوں، امروہہ یا دیگر اتر پردیش کے یا پنجاب اور دیگر ہندوستانی خطوں سے ہجرت کرکے یہاں آئے تھے۔ ان ہی میں جالندھر سے ہجرت کرکے آنے والے پاکستان کے قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری(1900ء-1982ء) بھی تھے۔ اپنے چھوڑے ہوئے شہروں کی یاد میں اپنے نام کو ہی ان شہروں کی طرف منسوب کرنے کا رویہ بھی نفسیاتی مطالعے کی دعوت دیتا ہے۔ بہرحال پاکستان کے قیام اور اس کی بنیادوں کے بارے میں ہونے والے مباحث کو جب حفیظ کے ہاں ادبی اظہار دیتا ہے تو کچھ ایسی شکل سامنے آتی ہے:

اٹھو صنم کدے والو تلاش لازم ہے
یہیں کو لوٹ پڑیں گے اگر خدا نہ ملا

(حفیظ جالندھری)

صنم کدے سے خدا کی تلاش میں آنے والے یہ مہاجر واپس لوٹ جانے کا خواب اور راستہ بھی سوچ کر آئے تھے لیکن ان کے لیے واپسی کا کوئی بھی راستہ شاید باقی نہ بچا تھا۔ یہ ایک ایسی سوچ ہے جس کے بارے میں زیادہ بات چیت کرنا سرحد کے دونوں طرف کچھ اچھا خیال نہیں کیا جاتا بلکہ غداری جیسے الزامات کا سامنا بھی کرنا پڑ جاتا ہے چہ جائیکہ کے ایسے اشعار پر کھل کے بات کی جائے جس میں وہ تاریخ کے اس عظیم تغیر کے بارے میں اشارہ کرتے ہیں:

قافلے دلدلوں میں جا ٹھہرے
رہنما پھر بھی رہنما ٹھہرے

حفیظ جالندھری

پاکستان میں غزل کے اندر آنے والے استعاروں کی یہ نئی جہات روایت سے گہرا انسلاک بھی رکھتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی اپنے معانی میں وقوع پذیر ہونے والے تغیرات میں انفراد کی حامل بھی ہیں۔ پاکستان میں قافلوں، رہنماؤں اور رہبروں کے بارے میں ایسا بیان تھا جبکہ ہندوستان میں مجروح سلطان پوری (1920-2000ء) اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

مجروحؔ قافلے کی مرے داستاں یہ ہے
رہبر نے مل کے لوٹ لیا راہزن کے ساتھ

مجروح سلطان پوری

دوسری طرف ہندوستان میں عرفان صدیقی اور باقر مہدی (1927ء-2006ء) جیسا رویہ بھی تھا جو اپنی قوم کے لیے کسی قابل رہنما کے نہ ہونے کی صورت میں خود ہی سنبھلنے کی کیفیت سے دوچار تھے۔ باقر مہدی اظہار کرتے ہیں:

قافلے خود سنبھل سنبھل کے بڑھے
جب کوئی میر کارواں نہ رہا

باقر مہدی

سماجی اور طبقاتی حوالے سے سرحد کے دو طرف موجود ایک ہی زبان کے شاعر اور ادیب جس طرح کی تفاوت اور امتیازات کے شکار ہوئے اس ایک استعارے اور اس کے تلازمات کی مثالوں سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ قافلہ، رہبر اور رہزن اردو غزل کے وہ بنیادی استعارے ہیں جس پر اس کی مکمل تشکیل کو سمجھنے کی سعی بھی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر سعد اللہ کلیم رقم طراز ہیں:

"غزل صرف ایک صنفِ سخن نہیں یہ ہمارا ایک بہت اہم تہذیبی استعارہ ہے جو تین بنیادی کرداروں کے عمل اور ردِ عمل سے وجود میں آتا ہے

1۔ حسن

2۔ عشق

3۔ حسن و عشق کے درمیان حائل رکاوٹیں

جدید اصطلاحات اور نئی سوچ کی رعایت سے ہم انھیں " منزل "، " راہی " اور " رہزن " بھی کہہ سکتے ہیں اور مذہب کے حوالے سے کوئی اگر ان کو خدا انسان اور ابلیس قرار دینا چاہیے تو بسم اللہ۔۔"16

غزل کے اس تہذیبی استعارے کے بنیادی کرداروں کی یہ تقلیب اور تغیرات غزل کے نظام کی فکری جہتوں پر سرحد کے دونوں طرف اثر انداز ہوئے اور غزل کے عمومی موضوعات جو حسن، عشق اور اس میں موجود رکاوٹوں سے تعلق رکھتے تھے اس منزل کے راہی اور رہزن کو بدل کے فکری اعتبار سے نئے تعینات کے متقاضی ہوئے۔

غزل اپنے مزاج میں ہمیشہ سے دو مصرعوں میں مکمل بات کہنے کے اسلوب کی بنا پر سماجی اور طبقاتی شعور کی حامل رہی۔ اس میں علت اور معلول، دال اور مدلول یا سبب اور مسبب کے لازم و ملزوم ہونے نے عاشق اور محبوب یا عاشق اور رقیب کی دو اطراف کو فروغ دیا۔ عاشق اپنے بیان اور اسلوبِ زندگی میں پسے ہوئے طبقے کا نمائندہ رہا جبکہ محبوب شمعِ محفل بھی ہے اور یہ محفل بادشاہ کی محفل ہی کا عکس ہے۔ عاشق ہمیشہ محبوب کو اپنی محفل تک رسائی نہ دیے جانے اور نکال دیے جانے کے شکوے گلے کے ذریعے سے اپنے زمین پہ ہونے اور محبوب کے آسمان پہ ہونے کی بات کرکے دو طبقات میں کسی باہمی اشتراک کی بات کرتا ہے۔ دوسری طرف عاشق اس محفل میں جسے اپنا حریف سمجھتا ہے وہ رقیب ہے۔ یہاں سے دو طبقات اس سماج میں پھر سامنے آتے ہیں جن میں سے ایک اہلِ عشق ہیں اور دوسرے اہلِ ہوس ہیں۔ عاشق خود کو مجنوں کے قبیلے کا فرد بیان کرتا ہے جبکہ رقیب کو محض اپنے کچھ مفادات کے حصول تک کا جزوقتی گرویدہ قرار دیتا ہے۔

تاریخ کے ادوار کا مطالعہ ہمیں بیسویں صدی کے ربع آخر تک لاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ جدید دنیا ایک بالکل مختلف طرح کی سماجی کیفیت کا شکار ہو چکی ہے۔ نو آبادیاتی نظام کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد بننے والی نئی ریاستوں میں صنعتی اور بعد ازاں ٹیکنالوجی کے انقلاب نے دو دنیاؤں کی جنم دیا جن میں سے ایک کے قبضے میں سارے وسائل آ گئے اور دوسرے صرف صارف رہ گئے۔ یوں وہ

آبادکار جو ان ملکوں کو چھوڑ کے واپس اپنی حدوں میں لوٹ گئے مکڑی کے جالے کی طرح ایک ایسا نظام دے گئے جس کے نتیجے میں ان ممالک کی ساری دولت اور وسائل سے حاصل ہونے والا زرِ مبادلہ ان کی طرف منتقل ہونے لگا۔ ہمارے زیرِ مطالعہ شخصیت سیّد مبارک شاہ وطنِ عزیز پاکستان کی سول سروس کا حصہ رہے۔ اس سروس میں ابھی تک چلنے والے نو آبادیاتی نظام کے انداز و اطوار یا طور طریقے سیّد مبارک شاہ کی شخصیت سے میل نہ کھاتے تھے اس لیے انھوں نے زندگی اور سماج کو بہت قریب سے دیکھنے کے باوجود اس سے مغائرت کا رشتہ قائم نہ کیا بلکہ خود کو پسے ہوئے طبقے اور محرومی کا شکار ہونے والے لوگوں کے لیے نہ صرف ذہنی بلکہ عملی طور پر بھی جوڑے رکھا۔ شاہد مجید رانا لکھتے ہیں:

> سیّد مبارک شاہ نے اپنا دل کاٹ کر اپنے خون سے جیتے جاگتے شعر تخلیق کیے ہیں۔ رتجگوں میں اس نے جن خوابیدہ جہانوں کو کھوجا ہے ان کا بیان دریافت کرنا پڑتا ہے۔ جو کیفیت اس کی شاعری طاری کرتی ہے اس کے اظہار کے لیے لفظ ایجاد کرنے پڑتے ہیں۔17

شاعر اپنی فضا خود تخلیق کرتا ہے۔ اس کا گرد و پیش اور اس کے دل کی دنیا دونوں مل کے اس کے ہاں اظہار پاتے ہیں تو روزمرہ کی معمولی معمولی چیزیں اور جذبے جن کو عام آدمی کوئی نام دینے سے قاصر ہوتا ہے شاعر کی آنکھ اسے دیکھ کے اور اس کا قلم بیان کرکے اسے ایک مستقل اظہاریہ بنا دیتی ہیں۔

رونے والے ہر حالت میں روتے ہیں
اشک نہ ہو تو آنکھ نے بہنا ہوتا ہے
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص63

اشکوں کا بہنا اور آنکھوں کا بہنا زبان اور اظہار کے حوالے سے پہلے سے موجود محاورے میں اضافہ کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ یہ صورت صرف لفظ کی سطح پر ہی نہیں ہے بلکہ جذبے کی سطح پر بھی ہے۔ یہ داخلی کیفیت جہاں غزل میں شاعر کے دل کی دنیا کو بیان کرتی ہے وہیں نظم میں اس کے سامنے پھیلی دنیا سے چھوٹے چھوٹے وقوعے یوں بیان کرتی ہے کہ صرف حیرانی باقی رہ جاتی ہے۔

کراہت

بہت باہمی نفرتیں

اور کراہت بھرے ان گنت وسوسے

اپنے دل میں لیے

دونوں سوئے نہیں

ایک پل کے لیے

اپنے بستر پہ میں سانس روکے رہا

چھپکلی رات بھر مجھ سے چپکی رہی

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص69

سیّد مبارک شاہ کی زندگی اور شاعری دونوں حوالوں سے یہ نکتہ ہمارے سامنے آشکار ہوتا ہے کہ ان کے ہاں زندگی اور شاعری میں پایا جانے والا تصورِ خدا ایک ایسی کلید ہے جس کے ذریعے سے ان کی معاشرے اور کائنات کے ساتھ جڑت کو بھی دیکھا، سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر ابنِ عربی کے نظریات نے جس طرح سے مسلم سماج میں تصوف کے بیج بوئے تھے اور حسین بن منصور حلاج کے ذریعے سے انسان دوستی اور محکوم و مظلوم طبقے کے استحصال کو خدا کی ناراضی بنا کر پیش کیا گیا تھا اس نے بادشاہ یا خلیفہ کو دفاعی پوزیشن پہ لا کھڑا کیا۔ وہ جو جواب دہی سے خود کو دور کر چکے تھے تصوف کے ان نظریات کے سامنے خود کو مجرم بنتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ یہی وہ پیغام تھا جس نے سیّد مبارک شاہ کو حسین بن منصور حلاج کی زندگی اور تعلیمات میں پنہاں جذبے اور تحریک سے جوڑ دیا۔

> "مبارک شاہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی ذات کو پہچاننے اور کائنات کے بارے میں سوچنے اور غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ انھیں شکوہ ہے کہ انسان کی آنکھیں بندھے ٹکے نظریات کی گرد سے اٹی فضا سے آگے نہیں دیکھ پاتیں اور اس کا دل زنگ آلود ہو

چکا ہے۔ یہ اپنے مالک حقیقی کو دیکھنے اور جاننے سے قاصر ہے اور اسی لیے اس کے ظرف و ضمیر مردہ ہو چکے ہیں۔

دیکھ صورت دیکھنے کی اور ہی صورت کوئی
زنگ خودرہ سنگ پر کیا انحصارِ عکس ہے" 18

اسلامی تعلیمات میں موجود مواخات کے پیغام نے نہ صرف مسلمان کو مسلمان کا بھائی بنایا تھا بلکہ انھیں ایک دوسرے کا آئنہ بھی بنا دیا تھا۔ آئینے سے وابستہ شعری جمالیات اور استعاراتی جہات میں آئینے کو خدا کے ساتھ جوڑ کے پیش کرنے کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ تصوف کے سلسلے میں بھی اسے برتا گیا اور خدا کو اصل جبکہ باقی تمام کو عکس بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ دل کے آئینے کو صاف کر کے اس میں خلق کی محبت کو شامل کرنے کے لیے صوفیا اس آئینہ دل کو صاف کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ سیّد مبارک شاہ کی شاعری میں بھی یہ آئینہ اسی سماجی تعلق کو خدا سے جوڑنے کا ذریعہ بنا کر پیش کرتا ہے جسے خواجہ میر درد نے بھی اپنے انداز میں بیان کیا تھا۔

اے درد زنگ صورت اگر اس میں جا کرے
اہلِ صفا میں آئینہِ دل کو رو نہ ہو
(خواجہ میر درد)

آئینے سے یہ میل اُتارو گے تو چہرہ
ممکن ہے کہ پہلے سے بھی میلا نظر آئے
(سیّد مبارک شاہ)

سیّد مبارک شاہ کی شاعری اور ذات میں پائے جانے والے خدا ترسی اور رحم دلی کے یہ عناصر روایتی تصوف سے یہ ہی متعلق نہیں ہیں بلکہ ان میں جدید تعلیم کے ذریعے سے پیدا ہونے والی بین المذاہب اور بین الاقوام ہم آہنگی بھی کارفرما ہے۔ ایک بدلے ہوئے سماج میں جہاں تعلیم کے ذرائع مادری زبان کے بجائے رابطے کی قومی اور بین الاقوامی زبانیں ہوں اور علوم و فنون کی تحصیل میں بھی مضامین وہ ہوں جن کے ذریعے سے بین الاقوامی تعلیمی نظام میں جگہ بنانے کی سوچ کارفرما رہی ہو اس کے نتیجے میں سامنے والے اذہان زیادہ وسعت کے حامل بننے کے اہل ہو سکتے ہیں۔

سیّد مبارک شاہ بھی اسی نظام کا ایک مظہر ہیں جس نے بنیادی مذہبی تعلیم کی تحصیل گھر یا محلے کی مسجد اور مدرسے سے حاصل کی اور پھر جدید سکول، کالج اور یونیورسٹی سے فراغت کے بعد جو تعلیم یافتہ ذہن سامنے آیا وہ بہت سے انسانی، مذہبی، سماجی اور عمرانی پہلوؤں سے کچھ خصوصیات کا حامل ہے:

> "مبارک شاہ کے ہاں زندگی سے تعلق رکھنے والے عام دکھ، درد اور الم، عالم گیر انسانی محرومیوں اور شکست آرزو جیسے موضوعات میں ڈھلتے دکھائی دیتے ہیں۔ جن کا غم مجبوریوں اور محرومیوں سے لبریز ہے۔ مبارک شاہ سماجی تقسیم پر گریہ کناں اور نوحہ خواں دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے مالک کے سامنے بھی اُونچ نیچ، امیری غریبی کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ غریب ہمیشہ سے مظلوم رہا ہے جبکہ امراء طبقہ عیش پرستی، بد عنوانی، لوٹ کھسوٹ اور غریبوں پر ظلم کرنے میں مصروف ہے۔ غریب کے پاس دو وقت کی روٹی میسر نہیں ہوتی جبکہ امیروں کے خزانے مال و زر سے بھرے ہوئے ہیں۔"19

کسی بھی شاعر کے ہاں در آنے والے موضوعات دراصل اس کی ذہنی تشکیل کی خبر دیتے ہیں۔ زندگی اور سماج جس رخ پر کسی فرد کے ذہن کی پرورش و پرداخت میں دخیل ہوتے ہیں وہ اس کے اظہار میں سامنے آ جاتا ہے۔ زندگی کا وہ رخ جسے سیّد مبارک شاہ نے بیان کیا ہے وہ حادثوں، سانحوں، غموں، دکھوں اور استحصال کے خلاف ردِ عمل دیتا ہوا رخ ہے۔ شاعر ایک حساس دل کا مالک ہے۔ اس پر چھوٹے چھوٹے واقعات بھی اثر انداز ہوتے ہیں جو مل کر ایک ایسا جذبہ بن جاتے ہیں جس سے سماج کے ہر پہلو کی فلاح اور بھلائی اس کے پیشِ نظر ہو جاتی ہے۔ غفور شاہ قاسم اس ذہنی تشکیل کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہوتے ہیں:

> "سیّد مبارک شاہ کی نظم میں مواد، موضوع اور ہیت کی perfection موجود ہے۔ ان کی ہر نظم خیال کی نزاکت، احساس کی لطافت اور فنی گرفت کے حوالے سے قاری کو بھرپور انداز میں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ ان کا شعری سفر "جنگل گمان کے" سے لے کر "مدارِ نارسائی میں" تک پھیلا ہوا ہے۔"20

"جنگل گمان کے" سیّد مبارک شاہ کا پہلا شعری مجموعہ تھا جو 1993ء میں سامنے آیا۔ اس کتاب کا انتساب انھوں نے اپنی فکر پر اثر انداز ہونے والے سب سے اہم شخص "حسین بن منصور حلاج" کے نام کیا ہے۔ حلاج کا کردار اسلامی تاریخ میں ایک محبوب کردار کے ساتھ ساتھ معتوب کردار بھی ہے۔ اس کردار کی محبوبیت و معتوبیت کے اسباب مذہبی سے زیادہ سیاسی ہیں۔ انتساب کے ساتھ ہی ایک شعر بھی درج کیا گیا ہے۔

آدم کی کسی روپ میں تحقیر نہ کرنا
پھرتا ہے زمانے میں خدا بھیس بدل کر
(کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 47)

"جنگل گمان کے" ابتدائیے اور اختتامیے کی منظوم تخلیقات کے علاوہ غزلوں اور نظموں کی سات درجات میں تقسیم پر مشتمل ہے۔ کتاب میں "بنامِ خدا" اور "بنامِ رسول" میں بھی ایک طرح کا شکوہ در آیا ہے جو اقبال کے شکوے کی یاد بھی دلاتا ہے اور اسی طرح سے ہی خدا اور انسان کے تعلق میں انسانوں کے دکھوں کا بیان بھی بن جاتا ہے۔

درس تیرا لیس للانسان الا ما سعی
اور ہم تو فصل پکنے پر کساں کو لوٹ لیں
کلیات سیّد مبارک شاہ،،ص40

پہلی کتاب سے ہی شاعر نے اپنے فکری مسلک کے اشارے دے دیے۔ ایک ایسا شاعر جو اپنے مذہبی پیشواؤں اور خدا کے سامنے بھی انسانوں کی بے چارگی کا مقدمہ پیش کر رہا ہے۔ سیّد مبارک شاہ کے ہاں وحدت الوجود کے عناصر بھی موجود ہیں اور وجودیت کے بھی۔ وہ مذہب یا تصوف کی تعلیمات کے ذریعے سے سلوک کی منازل کی بات بھی کرتا ہے اور جدید زمانے میں موجود فرد کی زندگی میں در آنے والے انتشار اور مغائرت و بیگانگی کے عناصر بھی اس کی شاعری کا موضوع بنتے ہیں۔ قدیم و جدید کے اس امتزاج کے کچھ پہلوؤں کو ڈاکٹر شبیر حسن بیان کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

"کسی شاعر کا شعور اور فکر بہر حال اُس کی ذاتی زندگی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ

سکتا۔ اچھی اور معتبر سطح پر ذاتی زندگی گزارنے والا ایسا فرد جس نے زندگی سے بہت کچھ اپنی محنت اور قابلیت کے بل بوتے پر حاصل کیا ہو۔ ہمیشہ معراجِ انسانی پر نظر رکھتا ہے اور شاید اسی لیے مبارک شاہ کو عظمتِ انسانی سے بے پناہ عقیدت ہے۔ خدا سے سوال و جواب اور کہیں کہیں بے حد محبت کے باوجود اسی مالکِ کون و مکاں سے اُلجھ پڑنے کا رویہ بھی مبارک شاہ کے ہاں نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔" 21

معراجِ انسانی یا انسانی عظمت جس شخص کے پیشِ نظر ہو پھر اس کے سامنے چاہے کوئی بادشاہ ہو یا چاہے ان انسانوں کا حقیقی خالق وہ پسے ہوئے انسانوں اور محکوم طبقے کے لیے ان سے الجھ پڑتا ہے۔ ایک مساوی حقوق کے حامل معاشرے کا آدرش رکھنے والا شاعر ہی انسانوں کے درمیان وسائل کی مساویانہ تقسیم ہی نہیں بلکہ خوشیوں اور غموں کی بھی مساوی تقسیم کی بات کر سکتا ہے۔ یہ شاعری جہاں ایک درد سے معمور ہے وہیں اس میں علم الکلام اور فلسفے کی نکات بھی در آتے ہیں۔ یہ تصوف سے بھی علاقہ رکھتے ہیں اور جدید تعلیم سے بھی۔ اس کی جہات مذہبی بھی ہیں اور سائنسی بھی۔ یہ عمرانی و سماجی بھی ہیں اور روحانی و مابعد الطبیعاتی بھی۔ یہ دونوں لہریں شاعر کے ہاں نظم اور غزل دونوں اظہار کے قرینوں میں اپنا اظہار پاتی ہیں۔

مجھ کو مارا ہے اگر تو عدل کی تصلیب نے
وار تو میں سہہ گیا تھا ظلم کی تلوار کا

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص50

ہم جی رہے ہیں ایسے حوادث میں ان دنوں
جن کا کبھی گماں بھی تصور خراش تھا
کچھ سنگ ذہن لوگ جو ہم عصر تھے مرے
میں ان کا ہم زماں تھا محبت تراش تھا
بدلا ہوا تھا تیرگی کا رنگ اس قدر
نکلا جو آفتاب تو اندھوں پہ فاش تھا

ہم نے بڑے فریب میں کاٹی ہے زندگی
مقصد تمام عمر کا فکرِ معاش تھا

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص73

سیّد مبارک شاہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے ان کے دیرینہ دوست ڈاکٹر وحید احمد اپنی کچھ بحثوں اور مکالموں کے بارے میں راقم کو بتاتے ہیں کہ ہم اکثر اپنے عہد کے مہابیانیے پر بات کرتے تھے اپنے عصر کا سب سے بڑا مسئلہ معاشیات یا معاشی مسئلے کو قرار دیتے تھے۔ ان کے مطابق اسی بات کو انھوں نے اپنے ناول "زینو" میں بھی بیان کیا ہے۔(22)

معاش کے مسئلے نے ہمارے سماج کی جس طرح سے تقلیب کی ہے اس نے صدیوں میں تشکیل پانے والے معاشرے کی خوبیوں کو خامی بنا کے رکھ دیا ہے۔ بے غرضی نے نام و نمود کی جگہ لے لی اور روشنی کی جگہ اندھیرے در آئے اسی لیے شاعر کے ہاں بار بار یہ چیز اظہار پاتی ہے کہ نئی دنیا کے حقائق چاہے کچھ بھی ہوں لیکن ان حقائق کا بیان اپنی نئی جہات رکھتا ہے جس میں مسلم اقدار کو مبدل صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

اب اندھیرا بھی نظر آتا نہیں
رات کتنی بجھ گئی ہے دوستو
زندہ رہنے کی ہوس بڑھ جائے تو
یہ صریحاً خودکشی ہے دوستو

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص62

موت سا گہرا دکھ بھی سہنا ہوتا ہے
کتنا مشکل زندہ رہنا ہوتا ہے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص63

اندھیرا بھی پس منظر تو ہوگا
اگر پیش نظر کچھ روشنی ہے

سبھی کردار اکتائے ہوئے ہیں
بہت لمبی کہانی ہو گئی ہے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص64

اندھیرا اور روشنی دنیا کے عظیم ترین استعارے ہیں۔ قرآن حکیم میں بھی بارہا خدا اپنے دوستوں کو روشنی والا اور شیطان یا طاغوت کے ساتھیوں کو ظلمات والا کہہ کے بیان کرتا ہے۔ اسی طرح عالمی ادب میں روشنی حق کا استعارہ بنتی ہے جبکہ اندھیرا جہالت اور غموں کی علامت بن جاتا ہے۔ سیّد مبارک شاہ نے بھی ان دونوں پہلوؤں کو ان دو جڑواں استعاروں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مبارک شاہ جہاں ان استعاروں کو اپنی معکوس یا منقلب حالت میں بیان کرتے ہیں وہیں ان استعاروں کی مسلم و مروج جہات کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ یوں ان کے ہاں یہ استعارے ایک کولاج بناتے ہیں جہاں ان کی ایک سطح تو ہی روایت سے جڑی ہوئی ہوتی ہے جبکہ ایک سطح پر یہ اپنے معکوس معانی کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور کہیں یہ بیان طنزیہ بن جاتا ہے جہاں ہم اسے قولِ محال سے بھی جوڑ سکتے ہیں۔

> "سائنس میں کہا جاتا ہے کہ ہر عمل کا ردِ عمل ہوتا ہے۔ وہ بھی مخالف سمت ہوتا ہے۔ من و عن سیّد مبارک شاہ کی شاعری ہے۔ انھوں نے جس طرح محسوس کیا اور جو منظر بھی اُن کے پردہ تخلیق سے ٹکرایا تو انھوں نے اُسے ذرا مختلف اندازِ فکر اور اُنہی معنی کے ساتھ قارئین کی طرف لوٹا دیا۔" 23

جدید سماج کے مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے سیّد مبارک شاہ بھی اپنی نظم میں اسی مسئلے کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ تمام عمر صرف معاش کے مسئلے نے ہی انھیں یا فرد کو سر اٹھانے کی مہلت نہ دی۔ اس ایک مسئلے نے ہی روشنی اور اندھیرے کے معنی بھی بدل کے رکھ دیے ہیں۔ وہ جو خوب تھا اسے نا خوب کر دیا اور خوب کو بتدریج ایک طعنہ بنا کے رکھ دیا۔ اسی لیے ظلم کی تلوار کا وار تو سہہ جانے کا امکان موجود تھا لیکن عدل کی صلیب پر چڑھاتے ہوئے اس سماج نے فرد کے درست موقف کو بھی جرم بنا کے رکھ دیا۔ عدالت کے ذریعے سے کسی بھی سزا یا صلیب، دار یا زہر کے پیالے کا شکار ہونے والے لوگوں کے بارے میں ایک بنا بنایا نظریہ عوام میں سرایت کر جاتا ہے جو بالادست طبقے کی

طاقت ہوتا ہے اسی لیے وہ ان مظلوم لوگوں کو ان خطوط پر سوچنے کی طرف راغب نہیں ہونے دیتے کہ جن لوگوں نے نظام سے بغاوت کرتے ہوئے مروج اصولوں اور ضابطوں کو توڑا وہ ان کے کوئی خیر خواہ تھے یا انھیں نجات دلانا چاہتے تھے۔ اس کے مقابلے میں باغی کے لیے موجود سزا کو عدالت کے ذریعے سے نافذ کروا کے سقراط، حسین بن علی، حسین بن منصور حلاج، سرمد اور جدید زمانے میں پاکستان کے متعدد وزیرِ اعظم بھی اسی عدالتی نظام کی بھینٹ چڑھتے دکھائی دیتے ہیں اور ان کے خلاف بات کرنے والے طبقے میں شامل عوام اس شعور سے بے بہرہ ہوتی ہیں کہ سزا پانے والے لوگوں نے کس طرح اس عوام کے مفادات کی خاطر اپنے بنے بنائے منصب اور عزت و توقیر کو داؤ پر لگا دیا۔

اس صلیب جسم پر اے زندگی
تجھ کو کتنی دیر کھینچا جائے گا
اس طلسمِ آرزو میں ہم نفس
جینا چاہے گا تو مارا جائے گا

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص58

مجھ کو نبی نہ مانو ، مری بات تو سنو
اک عسکر غنیم ہے پیچھے چٹان کے

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص49

جسم کی صلیب پر کھینچی گئی زندگی کا نوحہ لکھتے ہوئے شاعر کا دھیان اپنے دل کی دنیا کی طرف ہی نہیں رہتا بلکہ اپنے ارد گرد اور پھر اپنی قوم، قبیلے، وطن ، خطے اور بالآخر تمام عالمِ انسانی اور اسی دنیا میں موجود دوسرے حیوانات بلکہ نباتات کی بات بھی کرنا شاعر کی حدود میں شامل ہو جاتا ہے۔ ان حدود میں آنے والے موضوعات فرد کی تنہائی بھی ہیں اور کائنات میں خدا کے عمل دخل کے ساتھ ساتھ مخلوق کی اس سے بغاوت بھی۔ رنگ و نسل اور ذات پات سے ماورا ہو کر سوچنے کی روش اسے آفاقی گہرائی اور گیرائی بخشتی ہے۔

"مبارک شاہ کے ہاں گہری اور قطعی سوچ ملتی ہے۔ وہ یقیناً ایک باشعور اور صاحب ادراک شاعر ہیں۔ انھوں نے خود کو ایک دائرے تک محدود نہیں رکھا بلکہ عالم گیر انسانیت کی سطح پر سوچا ہے اور نہ صرف انسانی مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے بلکہ عالمی سطح پر انسانوں کی استحصالی رویوں کو بھی اپنی شاعری میں شامل رکھا ہے۔"24

انفرادی زندگی کی جستجو
اجتماعی خودکشی ہو جائے گی

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 64

کٹ چلی ہے قیدِ عمرِ بے طلب
اب سزائے موت بھی ہو جائے گی

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص65

زندگی اور موت کی جہات کو بیان کرتے ہوئے شاعر زندگی کے امکانات میں موجود خوشیوں اور غموں کو اس سطح پر پہنچا ہوا دکھاتے ہیں جہاں زندگی کو اس کی روح کے مطابق فعالیت، تحرک اور زندگی پن کے ہونے سے عاری دکھاتے ہیں تو اسے موت سے تشبیہ دے دیتے ہیں۔ زندگی کی یہ سطح انفرادی ہو یا اجتماعی ہر دو صورتوں میں فرد یا افراد کو اپنے حق سے دست بردار ہونے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے اسی لیے جدید زندگی میں خودکشی کی روایت نے بھی جڑ پکڑی۔

"مبارک شاہ کی نظموں میں پرانی قدروں کا انہدام اور نئی قدروں کی تعمیر، اجنبیت، بے گانگی، بے سمتی، تنہائی، بے چارگی، کرب وسوسہ، تشکیک، اپنی ذات سے حتمی وابستگی، معتبر اور مسند وجود کی جستجو، ٹوٹتے بکھرتے رشتے، لمحوں کو گرفت میں لینے کی کوشش، شخصیت کا بکھرنا، جذباتی اور فکری نا آسودگی، آزادانہ جینے کی خواہش، ذمہ داریوں سے عہدہ بر آ ہونے کی تمنا اور دیگر کئی موضوعات فکری گہرائی اور قدرے منفرد اسلوب بیان کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔"25

زندگی قدیم و جدید کے قصے سے بھی عبارت ہے اور اس میں پیچیدہ انسانی رشتوں کی وہ اقدار بھی پائی جاتی ہیں جن کو کسی غرض یا فائدے کے بغیر نسلِ انسانی اپنے مجموعی ورثے میں شمار کرتی ہے۔ مادیت کے مارے ہوئے معاشرے میں ان اقدار کا انہدام شاعر کے لیے کسی سانحے سے

کم نہیں ہے۔ اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کے خاتمے کی یہ روش صنعتی عہد کے بعد روز افزوں ہو گئی۔ حساس ذہن کے مالک لوگ جب سماج میں پھیلے اس جبر کو محسوس کرتے ہیں تو انھیں زندگی کے بے معنی ہو جانے کی بات اس کھوکھلے وجود سے رہائی حاصل کرنے کی راہ دکھاتی ہے۔

ٹوٹ کر بکھرے گا جب پیکر مرا
کس کو ملبے میں ملے گا گھر مرا
حادثہ ہونے کو ہے سرزد کوئی
میرے سر کی زد میں ہے پتھر مرا
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص60

نکلوں بھی جو گزرے ہوئے لمحات کی زد سے
ڈر مجھ سے لپٹ جاتے ہیں آتے ہوئے کل کے
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 47

یہ حصار وقت میں زندہ رہنے کی خواہشیں
دلِ سخت جاں ترے حوصلوں کا کمال ہے
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص67

اتنے تھوڑے وقت میں کیا کیا نہ کچھ کرنے کی دھن
اتنی لمبی عمر میں کچھ بھی نہ کر سکنے کا ڈر
کلیات سیّد مبارک شاہ، ص68

زندگی اور موت کے مضامین میں سیّد مبارک شاہ کے ہاں آنے والے یہ اشعار اور نظمیں اس جدید سماج کے استحصالی نظام کی حقیقت عیاں کرتی ہیں۔ یہ وہی بات ہے جس کا خدشہ غالب کے ہاں بھی آتا ہے کہ اب وہ وقت خواب و خیال ہو چکا ہے کہ انسان ہر وقت تصورِ جاناں کیے ہوئے بیٹھا رہے۔ اسی طرح خرد کے خراباتیان ہر نئے دن کے ساتھ اپنے اپنے کام دھندوں کی طرف نکل پڑتے ہیں۔ زندگی انھیں سر اٹھا کے جینے کا موقع ہی نہیں دیتی۔ یوں یہ جدید سماج اور اس کا نظام ایک ایسا قفس بن جاتا ہے جس میں انسانی پرندوں کو ہر طرح کی سہولت میسر ہے لیکن پر کھول کے اڑنے

کی اجازت نہیں ہے۔ آنے والے کل کے خوف اسی معاش کے مسئلے سے جڑے ہوئے ہیں جس کی بات سیّد مبارک شاہ کرتے ہیں۔ کلاسیکی روایت میں یہ وعدۂ فردا تھا لیکن اب آنے والے کل کو بھی اپنے اپنے کام دھندوں اور رزق کے وسیلوں سے جڑے رہنے کی ایک ان تھک دوڑ ہے جس میں انسان کا عزم و حوصلہ ہر ہر قدم پر آزمایا جاتا ہے۔ انسانوں کی اس غلامی کا نوحہ لکھتے ہوئے جون ایلیا اشارہ کرتے ہیں:

یہ خراباتیانِ خرد باختہ
صبح ہوتے ہی سب کام پر جائیں گے
(جون ایلیا)

زندگی کے دکھوں اور موت کی طرف ایک رومانوی جھکاؤ کے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے محمد ارشد اپنے ایم۔اے کے مقالے میں اپنا تجزیہ پیش کرتے ہیں:

> "یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں زندگی کے تلخ حقائق کا اظہار اور درد مندی کے جذبات ایک خاص فلسفۂ غم تخلیق کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اب رونے کی سکت ہی باقی نہیں رہی اور اب کسی غم پر آنکھوں سے آنسو بہانا ممکن نہیں رہا۔ اب تو کوئی ایسا غم ملنا چاہیے جس سے دل سے دکھ کی یہ کیفیت ختم ہو اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سکون میسر آ جائے۔"26

سیّد مبارک شاہ کے ہاں ایک خاص موضوع عالمی سطح پر وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیاں بھی ہیں۔ ان تبدیلیوں میں جنگوں اور دوسرے ممالک پر طاقت ور ملکوں کے حملوں سے جڑا ہوا ہے۔ شاعر اس سب کو قرآنی اور اسلامی تلمیحات کے تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مظلوم اور وسائل سے محروم طبقات کے لیے ابابیلوں کے منتظر ہیں۔ وہ امریکہ کی جارحیت کی بنا پر اسے ہاتھی والوں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ عالمی تناظر میں اقوام متحدہ کے کردار اور طاقت وروں کے لیے اس کے سہولت کار ہونے کا غم بھی ان کے ہاں بیان ہوتا ہے۔

مبارک شاہ کی شاعری میں ابابیلیں قرآنِ حکیم کی صورت " الم ترکیف" کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ یہ مظلوم انسانوں کی مدد کا استعارہ ہیں۔

ابابیلیں مقید ہیں

خداوندا!

ترے گھر کا وہ دشمن ابرہہ نامی

جسے تیری ابابیلوں کے لشکر نے

بہت پہلے خس و خاشاک کر ڈالا تھا، زندہ ہے

اور اپنے لشکروں کے ساتھ زندہ ہے

وہ اب تیری ابابیلوں سے اونچا ہے

بہت پرواز کرتا ہے

خداوندا!

وہ اب اتنا قوی ہے کہ

خدائی میں اسی کی بادشاہی ہے

ترے گھر کو گرانے کی اسے اب کیا ضرورت ہے

کہ تیرے گھر کے والی بھی اسی کا نام لیتے ہیں

اسی کا ذکر کرتے ہیں۔

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 124

عرب دنیا کے عالمی استعمار کا سہولت کار ہونے کا دکھ اسلامی دنیا میں بہت شدت سے محسوس کیا جاتا ہے۔ خدا کے گھر کے رکھوالے ہی جب یہود و نصاریٰ کے ایجنڈے کو اپنے ممالک میں پروان چڑھاتے ہیں تو اس خطے کی طرف ایک تقدیس اور مذہبی رہنمائی کے لیے دیکھنے والوں پر کیا گزرتی ہے اس کا انداہ مبارک شاہ کی اس نظم سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ سورۃ الم ترکیف میں بیان کیے جانے والا

ہاتھی والوں اور ابرہہ کا واقعہ جس سنہ میں پیش آیا اسے اسلامی تاریخ میں "عام الفیل" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مبارک شاہ ساری دنیا کو ہی خدا کا گھر جانتے ہیں۔ اسی طرح مظلوم انسان کے دل کو بھی وہ خدا کے گھر سے ہی تعبیر کرتے ہیں۔ جو کوئی خدا کے ان گھروں کو پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے شاعر اس کے خلاف اپنی زبان، قلم اور ہاتھ کے ساتھ جدوجہد کرنے کی بات کرتا ہے۔

رب کعبہ! تجھے تیرے گھر کی قسم

جو سلامت رہا اور سلامت رہے

تا قیامت رہے

میرے برباد شہروں کی فریاد سن

ابرہہ کا جہاں لشکر فیل ہے

ہم کو پھر انتظارِ ابابیل ہے۔

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 119

بیسویں صدی کی دوسرے نصف میں تشکیل پانے والی ریاستوں میں عالمی استعمار اور نو آباد کاروں کے نمائندوں کو حکومتی مناصب تک پہنچنے دیا جاتا رہا۔ تیسری دنیا کے ممالک میں خود ان کی افواج نے اپنی منتخب حکومتوں کا تختہ الٹا اور اقتدار پر قبضہ کیا۔ یوں ان تمام ممالک میں جہاں جہاں نو آبادیاتی نظام کا خاتمہ ہوا تھا ایک اندرونی یا سیلف کولونائزڈ نظام نے جنم لیا جو اپنے عوام کے مفاد کو نہیں بلکہ طاقت ور ممالک کے مفادات کو پیشِ نظر رکھتا تھا۔ اس نظام کے کرشمے ابھی تک تیسری دنیا کے ممالک میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس سب کے لیے مبارک شاہ نے بنیادی استعارہ قرآنِ حکیم کی اسی سورت کو چنا اور اس سورت کے مختلف مظاہر کو بیان کرتے ہوئے ابرہہ کو امریکہ، برطانیہ، فرانس اور دیگر آباد کاروں کا استعارہ بنایا جبکہ "ابابیل" وہ مظلوم اور بے دست و پا انسان ہیں جن کی جدوجہد کے نتیجے میں ان اقوام کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ یہ استعارے بار بار ان کی شاعری میں اپنا ظہور پاتے ہیں:

الم ترکیف

جس گھڑی

میرے شہروں کی بستی ہوئی بستیاں

قتل کر دی گئیں

خوں سے بھر دی گئیں

کیا وہ لمحہ بھی تیری ہی تخلیق تھا

ص 118

تیسری دنیا اور اس میں خاص طور پر اسلامی ممالک کی دگر گوں حالت کے ساتھ ہی مبارک شاہ کی خاص محبت اپنے وطن سے بھی منسوب ہے۔ وہ اپنے ملک کی خوشیوں غموں، جنگوں اور ہمسایہ ممالک کے ساتھ پیش آنے والی جنگی صورتِ حال کو بھی محسوس کرتے ہیں۔ پاکستان کے حالات اپنی تخلیق کے وقت سے ہی جس نازک موڑ سے گزر رہے ہیں وہ ابھی تک ختم نہیں ہوا اس لیے ہمیشہ اس حساس ملک پر کڑا وقت ہی رہا ہے۔ فیض احمد فیض نے جس داغ داغ اجالے اور شب گزیدہ سحر کی بات کی تھی بعد کے عرصے میں بھی وہ صبح نہ آ سکی۔ صحنِ چمن میں بہار کے موسم کا انتظار ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہا۔ سیّد مبارک شاہ کی شاعری میں بھی ترقی پسند شعرا کی طرح ایک بہار کے آنے اور صبح کے طلوع ہونے کی خواہش موجود ہے لیکن یہ صبح جانے کب آئے گی کہ شاعروں کو ابھی تک ہر طرف جبر کی گھٹا چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔

فتح مبیں

(وطنِ عزیز کے موجودہ تناظر میں)

بے مثل بہار آئی ہے اس دیس میں اب کے
یہ جبر کی دیکھو تو گھٹا چھائی ہے کیسے
بارود کی بارش ہے کہ تھمتی ہی نہیں ہے

کس زور سے پھوٹے ہیں جواں خون کے چشمے
ہر اہلِ وطن ، چاک گریباں ہے وطن میں
پھر ہونے کو اک صبح غریباں ہے وطن میں
یہ کس نے لگا دی ہے ہر اک سانس پہ قدغن
مر جائیں گے جو لوگ بغاوت نہ کریں گے
منصف نے اگر عدل کو مصلوب کیا ہے
مجرم ہیں جو توہینِ عدالت نہ کریں گے
بہتا ہوا خوں زیست کی تفسیر لکھے گا
آزادیٔ انسان کے تقدیر لکھے گا

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص117

سیّد مبارک شاہ کی یہ نظم ترقی پسند استعاروں پر مشتمل ہے اور اسی طرح کے خوابوں کی بات کرتی ہے۔ بہار، جبر، گھٹا، بارش، بارود، جرم، مجرم، توہین، عدالت، خون، انسان اور آزادی ان تمام استعاروں کے ساتھ شاعر ایک ایسی فتح کی نوید سناتے ہیں جو بہتے ہوئے سرخ خون سے آئے گی۔ سرخ انقلاب کی یہ نوید انسان کی آزادی کی تقدیر لکھے گی۔ محکوم اور پسے ہوئے طبقے کے لیے لکھتے ہوئے ترقی پسند ادب کے دونوں طبقات یعنی بورژوا طبقہ جو استحصال کرتا ہے اور پرولتاری جن کو محروم رکھا جاتا ہے سیّد مبارک شاہ کے ہاں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ وہ صرف اپنے وطن کے لیے ہی پریشان نہیں ہیں بلکہ ان کی پریشانی اپنے برادر اسلامی ممالک کے لیے بھی یکساں طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ وہ عراق، افغانستان اور دیگر ممالک کا نوحہ بھی تحریر کرتے ہیں اور عرب ممالک میں پائی جانے والی استعمار دوستی سے بھی خائف اور نالاں ہیں:

ہم وہی لوگ ہیں (اہل عراق کا نوحہ)

ہم وہی لوگ ہیں

جن کے روشن دیے

اندھے شعلوں کی برسات میں جل گئے

جن کے سینوں سے اٹھتی ہوئی آہ کو

تم نے بارود کی گڑگڑاہٹ میں دفنا دیا

جنکی شفاف اجلی ہواؤں کو بھی

تم نے آخر دھوئیں سے ہی کفنا دیا

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 126 / 127

سیّد مبارک شاہ نے جہاں ترقی پسند شعرا کی طرح پسے ہوئے لوگوں کے نوحے کہے وہیں وہ اپنے آپ سے، اپنے رشتوں سے اور ان کی نزاکتوں سے بھی بے خبر نہیں رہے۔ اردگرد کے اور دور دیسوں کے دکھوں کو لکھتے ہوئے انھوں نے خود سے وابستہ لوگوں کو بھلایا نہیں۔ عام طور پر شاعر ساری دنیا کے دکھوں کے نوحے تو لکھتے ہیں لیکن اپنے ذمے میں آنے والے لوگوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ مبارک شاہ ذاتی زندگی میں بھی اپنے والدین، بھائی بہنوں اور بیوی بچوں کے لیے بہت مشفق اور مہربان تھے۔ 27

سیّد مبارک شاہ کو اللہ تعالیٰ نے اولاد کی نعمت سے نوازا تو ان کے دو بیٹے اور بیٹیوں کو حیات بخشی لیکن ایک بیٹی کو جلد اپنے پاس بلا لیا۔ اس سانحے نے مبارک شاہ کی زندگی پر دور رس اثرات مرتب کیے۔ ان کی بیٹی عطیہ جو ان کو چھوڑ کر اگلے جہان میں چلی گئی تھی اس کے غم میں یہ شاعر جس نے اپنے اردگرد وقوع پذیر ہونے والے واقعات و سانحات کا غم رویا تھا اپنے اس ذاتی صدمے پر خود کو کتنا بے بس محسوس کرتا ہے اپنی مختصر سی نظم میں وہ اس کا اظہار کرتے ہیں:

نوحہ

(عطیہ کے لیے)

کوئی سانحہ ہو

کوئی حادثہ ہو

کوئی قوم تڑپی

کہیں پر کوئی شہر اجڑا

کسی ہنستے بستے شہر آباد میں

گھر کسی کا لٹا

جب بھی ٹوٹی قیامت کسی پر تو میں نے

وہ غم آفریں اور الم خیز نوحے لکھے

جن کو پڑھ کر زمانے کی آنکھوں سے آنسو گرے

مگر

اپنی ننھی سی بیٹی کے مرنے پہ میں نے

کوئی شعر لکھا نہیں

اور رویا بہت

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص 172

اردو شاعری میں ہی نہیں بلکہ عالمی شاعری میں بھی ماتم اور گریے کے لیے نوحے اور مرثیے کا آغاز اولین اصناف کے طور پر ہوا۔ وہ پہلا نوحہ جو ہابیل کی موت پر اماں حوا کے ہونٹوں سے ادا ہوا ہو گا۔ یوں اپنے پیاروں پہ رونے اور ماتم کرنے یا گریہ گزاری کی روایت بہت پرانی ہے۔ جدید اردو نظم میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ اردو غزل کے اندر بھی غالب کے ہاں اپنے بھانجے عارف کا نوحہ اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ علامہ اقبال نے والدہ مرحومہ کے لیے جو نوحہ کہا اور اپنے استاد داغ کے لیے جو نوحہ لکھا وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ جمال پانی پتی لکھتے ہیں:

''غالب ہمارے ہاں پہلا آدمی ہے جس کے یہاں رشتوں کے ٹوٹنے کا عمل سب سے پہلے اندرونی طور پر شور ہوا" 28

سیّد مبارک شاہ اپنی والدہ سے ایک خاص محبت رکھتے تھے۔ان کی والدہ بھی اپنے لاڈلے بیٹے سے اتنی محبت رکھتی تھیں کہ انھوں نے ہمیشہ باقی اولاد ہونے کے باوجود انھی کے پاس رہنے کو ترجیح دی۔ جب تک سیّد مبارک شاہ واپس نہ آتے وہ سوتی نہ تھیں۔ 29

والدہ کی رحلت کے بعد سیّد مبارک شاہ نے ان پر متعدد نظمیں کہیں جن میں جذبے کی شدت اور غم کے احساس کو بہت شدت سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔انھوں نے ماں کے لیے جو نظمیں لکھیں ان میں "کہاں گئے ہو"، "ایک یاد"، "شکوہ"، "بدل گئی ہو"، "ایک مکمل ادھوری نظم" اور نہیں میں رو نہیں سکتا" شامل ہیں۔ اس کے علاوہ غزلوں کے اشعار میں بھی انھوں نے اپنی ماں کا ذکر کیا ہے۔

بدل گئی ہو

(ماں کے لیے)

تجھے خبر ہے

وہ ہاتھ دھرتی نے کھا لیے ہیں

جنھوں نے اپنی ہتھیلیوں میں

ہماری خاطر فقط دعائیں بھری ہوئی تھیں

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص377

اب میں اس کی قبر پہ بیٹھا سوچ رہا ہوں
میں نے ماں کا چہرہ غور سے کب دیکھا تھا

کلیات سیّد مبارک شاہ، ص379

ماں کے لیے سیّد مبارک شاہ ہمیشہ ایک بچے کی سی محبت کے ساتھ وابستہ رہے جبکہ ان کے والد کی شخصیت بہت بارعب تھی جن کے سامنے بولنے یا اظہار کرنے سے ان کے اندر ایک ڈر اور

جھجک رہی۔ زندگی بھر یہ تعلق ایک طرح کے حجاب اور فاصلے سے بندھا رہا لیکن والدہ کی وفات کے بعد والد کی باقی زندگی تک وہ اپنے والد سے بہت زیادہ قریب ہو گئے۔

> "مبارک شاہ جب اپنی والدہ کا تصور کرتے ہیں تو ان کی حیثیت ایک بچے کی طرح ہو جاتی ہے۔ انھوں نے اپنی والدہ کی رحلت پر جس بے قراری، اضطراب اور بے چینی کا اظہار کی ہے وہ والدہ سے محبت رکھنے والے ایک بچے کے درد و کرب اور تڑپ کا بے تابانہ اظہار ہے۔ مبارک شاہ نے اپنی والدہ کی جدائی کو اس طرح اپنی ذات میں سمو دیا ہے کہ یہ جدائی ایک مقدس اور پاکیزہ کیفیت بن گئی ہے۔"30

سیّد مبارک شاہ کی شاعری کے سماجی مطالعے سے ہمارے سامنے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ انھوں نے نہ صرف اپنی ذات کے دکھ بیان کیے بلکہ وہ اپنے اردگرد کی دنیا سے بھی جڑے رہے۔ انھوں نے اپنے خاندان، اپنے دوستوں، شاعروں، ادیبوں، اسلامی دنیا کے ممالک اور انسانوں کے ساتھ ساتھ ایسے حشرات اور حیوانات و نباتات کے لیے بھی لکھا جو ہماری دنیا کا حصہ ہیں۔ چھپکلی جیسی کریہہ مخلوق کے بارے میں بھی وہ اپنے جذبات کا بیان کرتے ہوئے چھپکلی کے احساسات بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ شاید وہ بھی انسانوں سے ویسی ہی کراہت محسوس کرتی ہو گی جس طرح کی خود انسان۔ امریکا اور دیگر استعماری قوتوں کو انھوں نے ابرہہ سے تشبیہ دی ہے اور اس کے خلاف جدوجہد کرنے والے کمزور لوگوں کو ابابیلوں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں اپنی بیٹی، بہن اور ماں کے لیے بھی نوحے موجود ہیں اور سو بچوں کو قتل کر کے ان کو تیزاب میں ڈبو کے مار دینے کے سانحے پر انھیں اپنے اظہار کے عجز کا بیان کرتے ہوئے بھی دیکھا جا سکتا ہے:

> "ذکر یہ ہو رہا تھا کہ ہم نے 28 نومبر کو قحط اطفال سے متاثر ہو کر علامہ اقبال کے پوز میں بیٹھ کر ایک انتہائی پر سوز نظم لکھنے کا ارادہ کیا اور نظم آغاز کی۔ اسی لمحے T.V پر B.B.C کی خبریں نشر ہونا شروع ہو گئیں۔ بہت غصہ آیا کہ کیسی بے ساختہ لائن سوجھی تھی اور ان بدبختوں نے نظم کا بیڑا غرق کر دیا۔ ہیڈ لائنس میں ایک خبر یہ بھی تھی کہ پاکستان کے شہر لاہور میں کسی نامعلوم شخص نے سو بچوں کو قتل کر کے ان کے جسموں کو تیزاب میں تحلیل کر دیا۔ نظم کا بیڑا دراصل اب غرق ہوا تھا۔

دل صاحبِ اولاد سے انصاف طلب ہے۔ اس خبر پر کیا لکھا جائے جو سنی ہی نہ جا
سکے۔ اس سانحے پر کیا شعر کہا جائے جس پر بین بھی نہیں سوجھتے۔"31

سیّد مبارک شاہ اپنے اردگرد کی دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے سانحوں کو نظم میں ڈھال کر اپنا کتھارسس کرتے رہے۔ وہ لوگ جن سے وہ خود متاثر ہوئے یا قومی سطح کے رہنماؤں اور سماجی شخصیات کے علاوہ شاعروں ادیبوں کی وفات پر بھی انھوں نے لکھا۔ مختلف شخصیات پر ان کی نظموں میں مجید امجد، اختر حسین جعفری، احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض، "حکیم محمد سعید کے لیے"، "حادثہ"، "کبھی ایسا بھی ہوتا ہے"، "Explosives Factory 94"، "گیاری"، "ھر پارکر"، "صبح کا اخبار" ، "تشکر"، "ہماری دھرتی چیخ رہی ہے(سیلاب92) اور "پرواز 451-"، شامل ہیں۔

سیّد مبارک شاہ پاکستان کی سول سروس سے وابستہ رہے اور یوں انھیں ریاستی معاملات اور سماجی صورتِ حال میں بیوروکریسی کے عمل دخل کو بہت قریب سے دیکھنے اور اس کا حصہ بننے کا موقع میسر آیا۔ اپنی اس ملازمت کے اچھے برے پہلوؤں کو اور اس کی مشکلات و مسائل کو بھی انھوں نے اپنی کئی نظموں کا حصہ بنایا۔ اس حوالے سے کچھ اہم نظمیں "تیس جون"، "ڈکٹیشن"، "بیوروکریسی"، "منگلا ریسٹ ہاؤس" اور "ڈیفنس کلب" ہیں۔

حوالہ جات

1۔ نور الحسن، نیر کاکوروی، نور اللغات، جلد سوم، جنرل پبلشنگ ہاؤس، کراچی: 1959ء، ص283

2۔ سیّد احمد دہلوی، فرہنگِ آصفیہ، جلد سوم، ص2124

3۔ ایضاً، ص2124

4۔ نور الحسن، نیر کاکوروی، نور اللغات، جلد چہارم، اشاعۃ العلوم پریس فرنگی محل، لکھنو: 1931ء، ص586۔587

5. Elgin F. Hunt and David C. Colander, **Social Science: An Introduction to the Study of Society**, Sixteenth Edition Chapter 1, Page 1

6۔ محمد سرور، ڈاکٹر، شہریت، علمی کتب خانہ، لاہور: س۔ن، ص34

7۔ مظہر الحق، Elements of Cities، علمی کتب خانہ، لاہور: س۔ن، ص2

8۔ ابن خلدون، مقدمہ ابنِ خلدون، نفیس اکیڈمی، کراچی: 2001ء، ص45

9۔ صلاح الدین ناسک، افکارِ سیاسی(مشرق ومغرب)، عزیز پبلشرز، لاہور: ص581

10. مارکس، کارل، کیمونسٹ پارٹی کا مینی فیسٹو، دارلاشاعت ترقی، ماسکو، تیسرا ایڈیشن، 1975ء، ص18

11۔ رشید حسن خاں، زٹل نامہ(جعفر زٹلی کلیات)، آج کی کتابیں، کراچی: 2012ء، ص19

12۔ روش ندیم، ڈاکٹر، ماہنامہ آن کوٹ (بریڈ فورڈ)، شمارہ 30، نومبر دسمبر 2002ء، ص45

13۔ فتح محمد ملک، ڈاکٹر، تعصبات، سنگ میل لاہور: 1991ء، ص135

14۔ عبد الحسین زرّیں کوب، ڈاکٹر، گلستان عجم، مرکز تحقیقات فارسی، ایران و پاکستان: 1985ء، ص151

15۔ دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور، 1975ء، ص490

16۔ سعد اللہ کلیم، اردو غزل کی تہذیبی اور فکری بنیادیں، الوقار پبلی کیشنز، 2005ء، ص ج

17۔ شاہد مجید رانا، دیباچہ، زمیں کو انتظار ہے، فن سٹی پبلی کیشنز، راولپنڈی، 1995 ص 12

18۔ محمد ارشد، مدارِ نارسائی میں (سیّد مبارک شاہ)کا تجزیاتی مطالعہ، مقالہ ایم اے اردو 2012 گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج، بہاول پور: ص17

19۔ ایضاً، ص22

20۔ غفور شاہ قاسم، پاکستانی ادب، شناخت کی نصف صدی، ریز پبلی کیشنز، راولپنڈی، 2000ء، 361

21۔ شبیر حسن، ڈاکٹر، انٹرویواز (راقم) اتوار، 9 فروری 2020ء، رات 8 بجے

22۔ وحید احمد، ڈاکٹر، انٹرویواز راقم بروز سوموار، بمقام راولپنڈی: 30 دسمبر 2019ء

23۔ خرم جمیل از انٹرویواز محمد ارشد، 41 جون 2012ء، جمعرات، دن بارہ بجے

24۔ محمد ارشد، مدارِ نارسائی میں(سیّد مبارک شاہ)کا تجزیاتی مطالعہ،، محولہ بالا: ص35

25۔ ایضاً، ص39

26۔ محمد ارشد، مدارِ نارسائی میں(سیّد مبارک شاہ)کا تجزیاتی مطالعہ،، محولہ بالا:ص34

27۔ نصرت شاہ، سیّدہ،انٹرویو،(راقم)بروز سوموار، بمقام راولپنڈی:30 دسمبر 2019ء

28۔ جمال پانی پتی، ادب اور روایت، کراچی: المدثر اکیڈمی، 1994ء، ص:21

29۔ نصرت شاہ، سیّدہ،انٹرویو، از راقم، بروز سوموار، بمقام راولپنڈی:30 دسمبر 2019ء

30۔ محمد ارشد،مدارِ نارسائی میں (سیّد مبارک شاہ)کا تجزیاتی مطالعہ،، محولہ بالا، 34

31۔ مبارک شاہ، سیّد، برگد کی دھوپ میں، سروش پبلی کیشنز، فیصل آباد، 2000ء، ص233

ماحصل

سیّد مبارک شاہ جدید اُردو پاکستانی شاعری میں ایک اہم اور رجحان ساز نام ہے۔ سیّد مبارک شاہ نے منفرد اسلوب، سادہ طرزِ بیان اور گہرے فلسفیانہ رنگ میں اپنی شاعری کو عام فہم بنایا۔ اُن کی شاعری میں کائنات، فطرت، وجودیت، مثالیت اور انسانی زندگی کے گہرے تجربات و مشاہدات نمایاں نظر آتے ہیں۔ سیّد مبارک شاہ نے اپنے تخیلات کے اظہار کے لیے چھوٹی، بڑی بحور اور روزمرہ الفاظ کو اپنایا۔ المختصر ان کی شاعری میں بھاری بھرکم تراکیب اور لفاظی نظر نہیں آتی۔ ان کی شاعری میں جا بجا تنقید حیات، صوفیانہ تصورات، سائنس اور دوسرے سماجی علوم، فلسفہ تشکیک، انسانی و سماجی مسائل اور انسان کی جذبی کیفیات کے عناصر نمایاں ہیں۔

تصوف سیّد مبارک شاہ کی شاعری کا بنیادی موضوع ہے۔ ان کی شاعری کی بڑا حصہ اسی موضوع کے ارد گرد گھومتا ہے۔ سیّد مبارک شاہ نے اُردو شاعری میں اقبال کے بعد خدائے بزرگ و برتر سے مکالمہ کرنے اور توحید و تشکیک کے موضوعات کو نئے زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری میں ابلیس کے حوالے سے نئے مضامین اور زاویہ ہائے فکر ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ سیّد مبارک شاہ نے اپنی شاعری میں جگہ جگہ منصور حلاج سے اپنے فکری ربط کو ظاہر کیا ہے جو کہ منصور کی مشہور کتاب "الطواسین" کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ الٰہیات سیّد مبارک شاہ کی شاعری کا سب سے اہم موضوع ہے۔ انسان اور خدا کا تعلق ان کی شاعری میں جا بجا ملتا ہے۔

غالبؔ سے اردو شاعری میں فلسفہ اور جدید علوم کے ابتدائی مباحث متعارف ہوئے۔ اس کے بعد اقبال کے ہاں بھی کونیات اور طبیعات کے موضوعات پر اشعار ملتے ہیں۔ سیّد مبارک شاہ شعراء کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے اکیسویں صدی میں قدم رکھا تو اپنے شعری تجربے میں سائنسی اور کونیاتی مباحث کو بھی سمویا۔ سائنس اور کونیات کی ترقی کی دوڑ میں شاعر نے خود کو لاعلم نہیں رکھا بلکہ ان کی شاعری میں ان علوم کی کچھ جہتوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سیّد مبارک شاہ نے صرف کائنات کی وسعت پر ہی نظر نہیں دوڑائی بلکہ ننگی آنکھوں سے نہ دکھائی دینے والے انتہائی چھوٹے اجسام پر بھی نظمیں لکھیں۔

میتھیو آرنلڈ کا ایک جملہ ادب کے بارے میں بہت مشہور ہے کہ ادب تنقیدِ حیات ہے۔ دراصل ادب کسی بھی معاشرے کا سب سے اہم حوالہ ہوتا ہے۔ یہ نہ صرف اس معاشرے کو

سمجھنے میں قاری کی مدد کرتا ہے بلکہ اس کے تمام سنجیدہ پہلوؤں کو سامنے رکھتا ہے جس سے اس معاشرے کی فکری نمو کو جلا ملتی ہے۔ شاعر تبھی سماجی شعور کا حامل ہو گا جب وہ ایک حساس دل کا مالک ہو۔

سیّد مبارک شاہ کی شاعری عصر حاضر کی نمائندہ شاعری ہے۔ جدت پسندی، منفرد اسلوب اور موضوعات کی ندرت سیّد مبارک شاہ کی شاعری کا خاصا ہے۔ ان کی شاعری میں جا بجا چونکا دینے والے عناصر اور نہایت لطیف جذبات و احساسات سے مزین اشعار ملتے ہیں۔ ان کی شاعری میں طبقاتی کشمکش، سماجی ناہمواریاں اور غربت و افلاس سے جنم لینے والے مسائل کی تصویر نظر آتی ہے۔ شہر دل کی بربادی کے ماتم دار سیّد مبارک شاہ نے شہر آشوب کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے اُردو شاعری کے قدیم رومانوی اسلوب پر جدید فکریات کا اطلاق کیا۔ سیّد مبارک شاہ 80ء کی دہائی میں اپنے شعری سفر کا آغاز کرنے والے اہم شاعر ہیں۔ اس تحقیق میں ان کی شاعری کی انفرادیت کا تجزیہ کیا گیا ہے جو کہ ان کی شاعری کی تفہیم کے ساتھ ساتھ سیّد مبارک شاہ کی ذات اور ان کی فکری اپج کو سمجھنے میں بھی معاون ہو گی۔

کتابیات

بنیادی ماخذ

مبارک شاہ، سیّد، جنگل گمان کے، ماوراء پبلشرز، لاہور، 1993ء

مبارک شاہ، سیّد، ہم اپنی ذات کے کافر، سنگ میل پبلشرز، لاہور، 1995ء

مبارک شاہ، سیّد، زمیں کو انتظار ہے، فن سٹی پبلی کیشنز، راولپنڈی، واہ کینٹ، 1995ء

مبارک شاہ، سیّد، مدار نارسائی میں، الرزاق پبلی کیشنز لاہور، 1998ء

مبارک شاہ، سیّد، برگد کی دھوپ میں (سفرنامہ)، سروش پبلی کیشنز، فیصل آباد، 2000ء

مبارک شاہ، سیّد، کلیات سیّد مبارک شاہ، جہلم بک کارنر، جہلم، 2017ء

مبارک شاہ، سیّد، سراب مستقیم (تحقیق / قرآنیات) (غیر مطبوعہ)

مبارک شاہ، سیّد، انا الحسین (مداح سے روحانی روابط) (غیر مطبوعہ)

مبارک شاہ، سیّد، Never Again" Never (ایک یہودی مصنف کے جواب میں) (غیر مطبوعہ)

ثانوی ماخذ

ابن خلدون، مقدمہ ابنِ خلدون، نفیس اکیڈمی، کراچی: 2001ء

اختر بستوی، ڈاکٹر، سیکولرزم اور اردو شاعری، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو، 1996ء

ارشد محمود، تصور خدا، گورا پبلشرز، لوئر مال، لاہور 1997ء

جلالپوری، علی عباس، روایاتِ فلسفہ، خرد افروز، جہلم: 1986ء

جمال پانی پتی، ادب اور روایت، کراچی: المدثر اکیڈمی، 1994ء

رشید حسن خاں، زٹل نامہ (جعفر زٹلی کلیات)، آج کی کتابیں، کراچی: 2012ء

سعد اللہ کلیم، اردو غزل کی تہذیبی اور فکری بنیادیں، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، 2005ء،

سلمان باسط، خاکی خاکے، استعارہ پبلی کیشنز، اسلام آباد، 1999ء

صلاح الدین ناسک، افکارِ سیاسی (مشرق ومغرب)، عزیز پبلشرز، لاہور، س۔ن

طیب ابدالی، محمد، ڈاکٹر، اردو میں صوفیانہ شاعری، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، 1984

عبد الحسین زرّیں کوب، ڈاکٹر، گلستان عجم، مرکز تحقیقات فارسی، ایران و پاکستان: 1985ء

غفور شاہ قاسم، پاکستانی ادب، شناخت کی نصف صدی، ریز پبلی کیشنز، راولپنڈی 2000ء

فتح محمد ملک، ڈاکٹر، تعصبات، سنگ میل لاہور: 1991ء

کیلانی، مولانا عبد الرحمن، دین طریقت کے نظریات وعقائد، مکتبۃ السلام، لاہور، 2009

لینن، مارکس ازم کے تین سر چشمے، مارکسٹ انٹرنیٹ آرکائیو، اخذ شدہ بتاریخ 30 اگست 2020ء

مارکس، کارل، کیمونسٹ پارٹی کا مینی فیسٹو، دارلاشاعت ترقی، ماسکو، تیسرا ایڈیشن، 1975ء

محمد سرور، ڈاکٹر، شہریت، علمی کتب خانہ، لاہور: س۔ن

مظہر الحق، Elements of Cities، علمی کتب خانہ، لاہور: س۔ن

وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو ادب میں طنزو مزاح، سنگ میل، لاہور، 2005ء

وہاب قیصر، ڈاکٹر، غالب اور سائنس، سائنس اویرنس اینڈ پروموشن ٹرسٹ، حیدر آباد، ہندوستان، 2000ء

یوسف حسین خاں، ڈاکٹر، اردو غزل، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، 1996

انٹرویوز

احتشام علی، ڈاکٹر، از راقم، جمعہ، 10 مئی 2019ء، رات 9 بجے

احمد عطاء، از راقم، ہفتہ، 11 مئی 2019ء، دن 2 بجے

جام حفیظ لاڑ، ازراقم، بمقام رحیم یار خان، 11 مئی 2019ء

خرم جمیل از محمد ارشد، 14 جون 2012، جمعرات، دن بارہ بجے

سلیم سہیل، ڈاکٹر، از راقم، ہفتہ 4، مئی 2019ء، دن دو بجے

سلیم طاہر، از راقم، لاہور، بدھ، 5 جون 2019ء، دن گیارہ بجے

شبیر حسن، ڈاکٹر، از راقم، اتوار، 9 فروری 2020ء، رات 8 بجے

عباس تابش، از راقم، منگل، 3 مارچ 2020ء، رات 10 بجے

عثمان ضیاء، ڈاکٹر، از راقم، منگل، 11 مئی 2019ء، دن 3 بجے

فاطمہ، سیّد، ازراقم، سوموار، بمقام راولپنڈی: 30 دسمبر 2019ء

محمد نوید، برگیڈیئر، ڈاکٹر شعبہ فزکس، برن ہال، ایبٹ آباد، بدھ، 5 اگست 2020

نصرت شاہ، سیّدہ، انٹرویو، ازراقم، سوموار، بمقام راولپنڈی: 30 دسمبر 2019ء

وحید احمد، ڈاکٹر، ازراقم، بمقام راولپنڈی، بروز سوموار، 30 دسمبر 2019، رات 9 بجے

اخبارات ورسائل

ادب لطیف، ماہنامہ، شمارہ 9، لاہور، ستمبر 2020،

آن کوٹ، ماہنامہ شمارہ 30، بریڈ فورڈ، دسمبر 2002ء

ایکسپریس، روزنامہ، گوجرانوالہ، بروز جمعرات، 11 جولائی 2015ء

مقالہ جات

سعدیہ عاشق، سیّد مبارک شاہ کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ (مقالہ برائے ایم اے اردو)، مملوکہ شعبہ اردو نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، 2016ء

محمد ارشد، مدارِ نارسائی میں (سیّد مبارک شاہ) کا تجزیاتی مطالعہ، مقالہ ایم اے اردو، مملوکہ گورنمنٹ صادق ایجرٹن کالج، بہاول پور، 2012ء

کاشف علی، سید مبارک شاہ کی شاعری مابعد جدید تناظر میں، (مقالہ برائے ایم اے اردو)، مملوکہ جی، سی یونیورسٹی، فیصل آباد، 2021ء

غیر مطبوعہ مضامین

شہزادنیر،سیّد مبارک شاہ (ایک تنقید)،2021ء

ماکلی،شاہد،مجید امجد کی شاعری میں کونیاتی اور سائنسی وژن،غیر مطبوعہ،2021

للہ،محمود اسلم ،تاثرات،غیر مطبوعہ مضمون ،تعزیتی تقریب بیاد سیّد مبارک شاہ ،پاک ٹی ہاؤس،لاہور5 دسمبر2015

فرہنگ ولغات

سیّد احمد دہلوی، فرہنگِ آصفیہ،جلد سوم،عکس پبلی کیشنز،لاہور،2017ء

نور الحسن، نیر کاکوروی، نور اللغات، جلد سوم،جنرل پبلشنگ ہاؤس، کراچی:1959ء

نور الحسن، نیر کاکوروی، نور اللغات، جلد چہارم،اشاعۃ العلوم پریس فرنگی محل، لکھنو:1931ء

دائرہ معارف اسلامیہ،یونیورسٹی پریس، پنجاب یونیورسٹی، لاہور،1975ء

International Islamic Univ.
CENTRAL LIBRARY
ISLAMABAD.